

کچڑا

حکی الدین نواب

# بچرا کمر

## محی الدین نواب

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام تامل	پچراگھر
مصنف	محی الدین نواب
کتابت	رشیر حسین
مطبوعہ	جمال پرنٹنگ پرنس دہلی
قیمت	ستہ روپے
ناشر	کتاب دالا ۲۹۷ پہاڑی جو جلد دہلی

محی الدین نواب کی تمام کہانیاں سچائی  
سے قریب تر ہوتی ہیں۔ صرف ان  
کے نام و مقام فرضی کرد یہ سمجھاتے ہیں  
تاکہ معاشرے کے گندے وجود بلبلہ کر  
فالوں چاہ جوئی نہ کر سکیں۔

قیمت — ۱ روپے

کتاب دالا ۲۹۷ پہاڑی کھو جلد دہلی

## (نسلی سبب)

ان اساتذہ کے نام  
جن پر قوم کو فخر ہے

# فہرست

5

کھرا گھر

پہنچ سب اپنے 105



# پھر اگھر

## محمد الدین نواب

۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کی آخری رات ہے۔ آدنی رات کو ٹھیک بارہ بجے کی پہلی ٹن کے ساتھ یہ سال گزر جائے گا۔ پھر بارہ بجے کی آخری ٹن کے ساتھ پھول کا عالمی سال شروع ہو جائے گا۔ ابھی گھڑی کا چھوٹا کاشٹا بارہ پر ہے اور بڑا کاشٹا بارہ پر آنے والے ہے۔ جب دونوں کاشٹے مل جائیں گے اور بارہ بج جائیں گے تو پھر اس دنیا کے تمام بڑے کاشٹے، پھول جیسے بچوں کے بارہ بجانا شروع کر دینے کے لئے۔

دسمبر کی رات سرد اور کھرا لوڈ ہے۔ کھر کے دھند لکے میں ایک کھرا گھر کی چار دیواری نظر آہی ہے۔ آس پاس جتنے مکانات اور دکانیں ہیں۔ سکول اور پارک وغیرہ ہیں، ان کا کھرا وہاں اکر جمع ہوتا رہتا ہے۔ اب بارہ کھرا گھر پاؤں سے فل ہو چکا ہے۔ ایک پیشہ کی طرح برہضی کاشٹکار ہو کر قتے کر رہا ہے اور کھرے کو باہر سڑک کی طرف اگلتا جا رہا ہے۔

اب رونوں کا نٹے مل رہے ہیں۔ گھری کا پنڈوں کی ارزتے ہر کے پہلی  
آزادی رہا ہے۔ "ٹن"!

ٹن .. آغاز پڑھائے

۔۔۔ آپ بڑی سی قیمتی کار سٹرک کے کنارے آگرک رہی ہے۔ اس کی وجہ لامبی بجھ رہی ہے۔ کار کے اندر تاریکی ہے۔ (مگنی سیدٹ پر دوسرائے نظر آ رہے ہیں۔ وہ انسان ہیں مگر تاریکی میں بہوت نظر آ رہے ہیں۔)

ن .. دہ کار میں چھپے ہوئے تختا طائفوں سے باہر در  
تک دیکھ رہتے ہیں۔ دہ مجرم ہو سکتے ہیں۔

میں... دہ جاسوس ہو سکتے ہیں۔ چھپ کر یہ دیکھنا چاہئے ہیں  
کہ جرامگی آئیں کیسے ہوتی ہے؟

ٹن... دہ میونسپلٹی کے آفیسر ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھنے آئے ہیں کہ ان سکرچکرنے کے لوگ اس کچرا گھریں کچرے کی تاریخ کیوں مرتب کر رہے ہیں؟

ٹن... ایک سایہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا ہے اور  
اب پچھلی سینٹ کا دروازہ کھول رہا ہے۔

۔۔۔ دروازہ کھلے سے کار کے اندر دھیمی سی روشنی ہو جاتی ہے۔ اس روشنی میں پچھلی سیدھی پر کچھ کچھ انظار آ رہا ہے۔

نہیں ہے۔ کچرا گدر پر نگہر سے اتنی دندہ ہوتا ہے کہ بعض بے چاروں کو اپنی کاریں کچرا لادر کر لانا پڑتا ہے۔

ٹن... اس نے کچرے کی باسکٹ اٹھائی ہے۔ اور کچپلا دروازہ بناد کر رہا ہے۔

ٹن... رات بڑی سرد ہے۔ وہ باسکٹ اٹھائے تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اور دمگ گھاٹتے ہوئے قدموں سے کچرا گھر کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔

ٹن... ہاؤس فل ہے۔ باہر زک کچرے کی سیع بھی ہے اس نے اس سیع پر باسکٹ رکھ دی ہے۔ اور اب واپس جا رہا ہے۔ آخری ٹن... بچوں کا عالمی سال شروع ہو چکا ہے۔ باسکٹ کی گود میں بچہ رہا ہے، نئے سال کی پہلی آواز سن رہا ہے۔ کچرے کی تعریف یہ ہے کہ غیر ضروری سامان، تن کی غیر ضروری غذا طبیعی اور انسان کی غیر ضروری جسمیں جو کھر سے باہر پھینکی جاتی ہیں۔ وہ کچرا کہلاتی ہیں۔ اور کچرا گھر کی تعریف یہ ہے کہ کوئی انگلی اٹھا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون کچرا کس کے کھر سکایا ہے۔ وہ سارے عالم کا کچرا ہے اور رہاں وہ سارے عالم کا بچہ ہے۔ وہ بچہ میرا ہے۔ وہ بچہ آپ کا ہے عالمی سال کا بچہ ہے۔

میدانام نظام ہے۔ چونکہ میں بوڑھا ہوں۔ اس لئے تمام بچے مجھے نظام بابا کہتے ہیں۔ میں مملکت کچرا آباد کا حاکم ہوں۔ میرے حکم کے بغیر کچرے کا ایک تنکا بھی ادھر سے اُدھر نہیں ہل سکتا ہے اور نہ ہی کوئی بچہ میری اجازت کے بغیر ٹوٹے پھولے کھلو نے اور روٹنے کے ملکر ڈے وہاں سے چن سکتا ہے۔ میرے پاس ہمیشہ ایک چاہکا رہتا ہے۔ اسے دیکھ کر کچرا پینے والے بڑے بوڑھے اور بچے سہم کر دور بھاگ جاتے ہیں۔ یا بچہ میرے حکم کی تعییل کرتے ہیں۔

میں گرمی کے موسم میں کچرا گھر کے باہر ہوتا ہوں۔ سردی اور بارش کے دنوں میں کوڑا کرکٹ کا چھوٹ حصہ اس گھر سے باہر نکال دیتا ہوں۔ اس طرح دہائی میرے رہنے اور سونے کی جگہ بن جاتی ہے۔ اس بات میں بڑے آرام سے کچرے کی سیع پرسور ہاتھا کر اچانک ہی انکھ کھل گئی۔ ایک بچے کے

رولنے کی آواز آرہی ہے، آواز بہت ہی قریب تھی۔ میں نے کچرا گھر سے سر زکال کر دیکھا۔ پہلے تو کچھ نظر نہ آیا۔ پھر ایک کار اسٹارٹ ہو کر مرٹنے لگا تو اس کی صیدلا اسٹک کی روشنی گھومتی ہتھی ایک باسکٹ پر سے چھل پھلتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے بعد وہ کار تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی نظر و ن سے ادھر جعل ہو گئی۔

بچہ رو بیاتھا۔ شاید اسے ٹھنڈا گ رہی تھی۔ میں کچرے پر جارہ ہاتھ پر دل سے رینگتا ہوا باسکٹ کے قریب آیا۔ پھر اسے قریب لے چھنے کراس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہ مکبل میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف اس کا سر مکبل سے باہر تھا۔ وہاں کچھ تو تاریکی تھی اور کچھ میری نظر میں کمزود تھیں۔ اس لئے میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لہن اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بچہ نہیں بھی ہے۔

میں نے مکبل سمیٹ اسے اٹھا کر سینے سے لگایا۔ پھر وہاں سے آٹھ کمر بعد تک دیکھتے ہوئے چھنے لگا۔

”یہ بچی کس کی ہے؟“ لے سے کس نے یہاں چینکا ہے بارے یہ کچرا نہیں ہے۔“

میں چھنے ہوئے بچی کو اٹھانے اور ادھر بھاگنے لگا۔ ہاید اسے چھوڑنے والے نظر آجائیں۔ شاید میری آواز کسی باپ کی غیرت والی آجائے۔ بچی بھی آدازدے رہ گیا تھی، شاید کسی ماں کی محنتا جاگ جائے۔ مگر یہ رات کی تاریکی بڑی حرام زادی ہوتی ہے۔

حرام جنہے کے بور گونگی بھری بن جاتی ہے ۔

میں چینتے چینتے نکل گیا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ میرے دست  
بچ رہے تھے۔ بچی بھی روتے جا رہی تھی۔ میں باسکٹ اٹھا کر پڑا گھر  
میں آگیا۔ اس وقت بچی تھوڑی ادبر کے لئے چپ ہرگئی۔ شاید اسے  
حرارت مل رہی تھی۔ کوڑے کر کٹ کے ڈھیر میں بڑی گرمی ہوتی ہے۔  
سکرٹ کے لٹٹے سے بکھرے ہوئے تمباکو کی بو، مچھلی، گوشت  
اور انڈے دیگرہ کی اسیاندے باسی چیزوں کی سڑانداز طرح طرح کی بُدلوُ  
جن کو نام نہیں دی سکتے۔ لیکن جن کی تاثیر سمجھو میں آتی ہے کہ  
انی ساری عفونت کے باعث کچرا گھر کی فضائیم ہو جاتی ہے۔

جب وہ حرارت پا کر چپ ہوتی تو میں سوچنے لگا۔ اس بچی کو کیا  
کروں؟ اسے کہاں چھوڑ کر آؤں؟ میں نے آج تک اپنے گھر کا کچرا  
کسی دوسرے کے دددازے پر نہیں پھینکا۔ دوسروں کی پھینکی ہوتی  
ہیزدی کو سمجھتا رہا ہوں۔ اب قدرت نے زندہ کچرا بیری گود میں لا کر ڈال  
 دیا تھا۔ مجھے کچھ پالنا نہیں آتا۔ میں سمجھلا اس کی پروردش کیسے کر سکتا۔  
نہما۔

دہ پھر وہ نے لگی۔ ڈری نخیلی تھی۔ کسی بڑے گھر کی بیٹی تھی۔  
میں او۔ او۔ او۔ آ۔ آ۔ آ۔ کی آدازیں نکالتے ہوئے اسے اپنے بازووں  
میں جعلانے لگا۔ لیکن وہ چپ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یقیناً اسے بھوک  
لگ رہی تھی۔ میں اسے دعوو ہو کہاں سے پلاتا؟ بڑے گھر کے لوگ

دودھ کے ڈبے پھینکتے تو انہیں کھڑچنے سے تھوڑا بہت دردھ پاؤ ڈر نکل آتا۔ لیکن اس وقت وہ بھی نہیں تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ جو اُسے چھوڑ گیا ہے وہ اس کا سکلا دبا کر بھی مار سکتا تھا۔ لیکن اس خیال سے چھوڑ گیا ہے کہ شاید زندہ پُر جائے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی زندگی کا بھی کچھ سامان کیا ہو گا۔ اس خیال کے آئے ہی میں باسکٹ میں باتھ ڈال کر ڈھونڈنے لگا۔ دہاں بھی کے نئے سے بیاس تھے۔ بیاس کے اندر کاغذات کی ایک گٹی ٹائی۔ سکھ رائج وقت اندر ہیرے میں بھی سونگھ لئے جائے ہیں۔ نوٹوں کی بُوزاروں میں پھانی جا سکتی ہے۔ پیرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بچی تو میرا مقدار چھپ کانے آئی تھی۔

وہ کتنی رقمہ ہو گی؟ نوٹوں کو گلنے کے لئے دل محل رہا تھا۔ مگر وہ رورہی تھی۔ اس کی آواز سنکرناست، چوکیدار، یا گشت کرنے والے سپاہی آ سکتے تھے اور باتھ آئی ہوئی دولت تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے باسکٹ کی فریضہ تلاشی لی تو ایک چھوٹی سی کیشی باتھائی اسے کھول کر سونگھ سے پتھر چلا کر شہد ہے۔ میں نے فوراً ہی ایک انگلی شہد میں بھکو کر بچی کے منہ میں رکھ دی۔ وہ ایک دم سے چُپ ہو گئی۔

وہ میری انگلی کو چوس رہی تھی۔ اس کے نئے سے ہونٹ ایسے ملام سے تھے کہ مکھن کی ملائکت بھی کچھ نہ ہو گی۔ وہ میری انگلی کو منہ میں کھنچ رہی تھی اور پیرا دل اس کی طرف کھنچیجا رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ

ماڈل کے دل کتنی شدّت سے اپنی تخلیق کی طرف کھینچے چلے جاتے ہوں گے۔ پس کھینچتا ہوں، اس وقت میرے اندر ممکنہ پیدا ہو رہی تھی۔ ایسا یقین پیدا ہو رہا تھا کہ وہ ساری کی ساری میری ہے۔ میں اب تک کچروں کا مالک تھا۔ اب ایک جنتی جگتی بچی کا بلا شرکت غیر مالک بن گیا تھا۔

وہ انگلی چوتے چوتے سو گئی۔ میں نے بڑی آہنگ سے اُسے سوکھ گھا سی اور بڑی ہوئی سبزیوں کے بستر پر ٹلا دیا۔ اس کی ماں اگر سنگدل نہیں ہو گی تو اپنی ایئر کنڈیشنر خواب گاہ کے معطر معطر ماحول میں اس بیبو سے گھبر کر بار بار سالن روک رہی ہو گی، جو اس کی نوزائیدہ بیٹی کے بستر سے اٹھ رہی ہے۔ الی بدنصیب برعقل عورتیں بھی ہوتی ہیں، جو اپنے بدن کی خوشبو نوچ کر پھینک دیتی ہیں اور ساری بڑی پھتاد کی بدو بیس سالن لیتی رہتی ہیں۔

میں نے نوٹوں کی گذی اٹھائی۔ اس گذی میں تشوٹو کے نوٹ تھے میں نے گنتی شروع کی۔ ایک سے پھا سی تک گذتا چلا گیا۔ پورے ہلکے ہزار روپ تھے مجھے یاد نہیں آیا کہ میں نے کتنے عرصہ بعد اتنے سارے روپے اکٹھے دیکھے تھے۔ وہ روپے اب میرے تھے۔ بالشت بھر کی بچی انھیں خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی بڑی رقم اس کے ساتھ اس نے رکھی گئی تھی کہ اسے اٹھانے والا بچی کو بھی اٹھانے۔ دوسرے لفظوں میں وہ بچی کو گود لینے کا معاد فرم رہا تھا۔

لیکن اتنی بڑی رقم دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ میں سے

کہاں چھپاؤں۔؟ پولیس دالے مجھے اس رقم کے ساتھ دیکھ کر بھی کہیں  
گے کہ میں نے کسی کے گناہ کو چھپانے کا معاوضہ لیا ہے۔ پھر وہ میرے پیچے  
پڑ جائیں گے کہ میں بھی کے ماں باپ کا نام بتاؤں۔ نہیں تباہ کوں گا تو  
ڈنڈے پڑیں گے۔ میں بنیک میں اکاؤنٹ نہیں کھول سکتا تھا۔ کیونکہ  
میں حساب نہیں دے سکتا تھا۔ یہ نہیں تباہ کر کے پانچ ہزار کی ایڈ  
کیسے جمع کرنی ہے؟

دولت آتی ہے تو پریشانیاں لیکر آتی ہے۔ مزید پریشانی یہ تھی  
کہ میں وہ رقم کوڑا کر کر ڈکی تھیہ میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ میونسلیٹی والوں  
کی طرف سے خطرہ نہیں تھا کہ وہ پچرا گھر کی صفائی کے لئے آئیں گے۔ خطرہ  
سیاسی لیڈروں سے تھا۔ الیکشن کے دن قریب آرہے ہے تھے۔ یہ حضرات  
اپنی کارکردگی سے متاثر کرنے کے لئے اپنے اپنے علاقوں میں اسکول  
اوہ اسپتال کھولنے، مٹرکیں بنوانے، پانی فراہم کرنے اور تمام علاقوں کو  
صاف ستمہار کھنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ کسی دن وہ ہنروں کو  
لیکر اس پچرا گھر کی صفائی کے لئے بھی آ سکتے تھے۔ اس لئے میں یہ رقم  
پچھے کی تھیہ میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

سوچتے سوچتے بہت دیر ہو گئی۔ رات گزرنے لگی۔ تب  
سمجھ میں آیا کہ دولت آتی ہے تو نیند کیوں نہیں آتی۔ غریب دولتند  
چوروں کے ڈر سے نہیں سوتے اس امیر دولتند کو انکم کیکس  
dalے سونے نہیں دیتے۔ آخر میرے دماغ نے سمجھا یا کہ میں یہ دولت

لیکر کیا کروں گا ہے مجھے نہیں وقت جھوٹا اور باسی کھانے کو مل جانا تھا  
پہنچ کے لئے چینہ ہٹرے میں ستر تھے۔ رہنے کے لئے مکان تھا۔ دل  
میں کوئی آندہ نہیں تھی، درد نہ اس کی نکیل کے لئے پیسوں کی حضورت  
ہوتی۔ جیسے کی انگ بھی نہیں تھی کہ مستقبل کے لئے بچت ایک یہم پر خالی  
کرتا۔ پھر وہ رقمہ میرے کس کام آسکتی تھی۔؟

بے شک یہی آئی بڑی رقمہ دیکھ کر خوشی سے چھوٹ گیا تھا۔ یہ آس لئے  
کہ انسان کو دولت کی ہو سکتی ہے ملٹی چلی آئی ہے۔ پیسے کی ضرورت  
ہو یا نہ ہو، تم اسے دیکھ کر ضرور خوش ہوتے ہیں، بہر حال جلد ہمایہ بات  
سمجھ میں آکئی کہ مجھے خوش نہیں ہونا چاہیے یہی نے اپنی زندگی میں چنان  
پایا، اس سے زیادہ کھو دیا۔ یہ رقمہ اور یہ بچی دنوں صبح ہوتے ہی چی  
جائیں گی۔

کچھرا آباد کی صبح اس طرح ہوتی ہے کہ اذان کے بعد سب سے پہلے  
میری حکومت کا راست نگ آ فر سرا آتا ہے۔ وہ بارہ برس کا ایک چھوٹ کراہی ہے  
اس کا نام کھاؤ ہے۔ اس لئے کہ بہت کھاتا ہے۔ اس کی ڈیلوٹی یہ ہے  
کہ باہر سے کھانے کا ختنا سامان میری مملکت میں پھینکا جاتا ہے وہ  
ان سب کو ٹوکریا کی جگہ رکھتا ہے۔ اس پاس کے فلیش، کوکھیوں  
اور دن کا نوں سے صبح پانچ بجے سے ابکر دن کے گیارہ بجے تک ہمارے لئے  
ناشتمہ پہنچتا رہتا ہے۔ گیارہ بجے سب سے پہلے اچھی چیزوں کا انتخاب  
کر کے میں خود کھاتا ہوں۔ کھاؤ اور کچھرا چلنے والے دوسرے پچھے

میرا منہ نکتے رہتے ہیں۔ جب میرا پیٹ بھر جاتا ہے تو کھا تو میرا جھوٹا کھا کے لئے بیٹھتا ہے اور دوسرے بچے اسی طرح منہ نکتے رہتے ہیں۔ پھر اس کا جھوٹا کھانے کے لئے دنی برس کی ایک لڑکا بچے کے دستِ خوان پر آکر بیٹھتی ہے۔

اس حپوکری کا نام سکینہ ہے۔ پھر آباد میں جو خالی ڈبے... اور... خالی بو تلیں دد آمد ہوتی ہیں، انھیں سکینہ سنبھال کر کھتی ہے جپوٹے بڑے کاغذات پن کران کا میندہ بنائی رباندھتی ہے۔ یہ تماں مالِ ردی اور شیشی بو تل خریدنے والوں کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے بچے جمال، راشد، نالدہ، لتو اور منو وغیرہ اس کھب سے بھوسی کر لیتے ہوئے کھلو نے، بنن اور ہیرپن جیسی نسبت سی چیزیں لکھ کر جمع کرتے ہیں۔ تمام دن محنت کرتے ہیں۔ اس لئے میں انہیں تین وقت کا بچا ہوا کھانا دیتا ہوں۔ ردی بیچنے سے جو خوری بہت رقم پا تھا تی ہے۔ اس میں سے کچھ مہر دل کو دیتا ہوں تاکہ وہ صفائی نہ کریں۔ پولیس کے آدمیوں کو دیتا ہوں تاکہ وہ مجھے پھرا گھر سے بے دخل نہ کریں۔ پچھا پنے کھانسی بخار کے لئے رکھنا ہوں۔ باقی پیے بچوں میں تقویم کر دیتا ہوں۔

نئے سال کی پہلی صبح میری گود میں ایک نئی سی بچی کو دیکھ کر تما بچے ٹھوک کرنے۔ وہ بچی اتنی حسین تھی کہ اس گندگی کے ڈھیر میں اسے دیکھ کر خود مجھے چین نہیں آتا تھا کہ وہ میری گود میں رکھی ہوئی ہے۔

لیکن دوسرے بچے کچھ اور ہی سوچ کر ٹھہر ک گئے تھے۔ راشد نے پوچھا  
”نظام بابا! کیا یہ بھی ہمارے حصے میں سے کھایا کرے گی؟“  
وہ بڑا اسیم سوال تھا۔ کوئی اپنے حصے کی روشنی کسی کو نہیں دینا چاہتہ  
کچھ آباد کی آبادی میں ایک بچی کا اضافہ نہیں ہونا چاہیتے تھا۔ میں نے کہا۔  
”غیرہ کرد۔“ میں ابھی اس بچی کو ٹھکانے لے گا کہ آتا ہوں میرے  
والیں آنے تک کوئی یہاں کھانے میں بے ایمانی نہ کرے۔ درست میں چاک  
سے کھال ادھیر ڈالوں گما۔“

میں بچی کو ایک کپڑے میں پلیٹ کر دیا۔ سے اٹھ گیا۔ کتنے ہی  
لڑکے لڑکیاں عصاف شہرے لباس پہنے اسکوں جا رہے تھے۔ ایک  
دکاندار نے پوچھا۔

”اے بڑھے! کیا لے جا رہا ہے؟“

”ایک بچی ہے!“

”کس کی ہے؟“

”آپ ہی کی ہے جی۔۔۔۔۔“

وہ سنسنے لگا۔ پتھر نہیں لوگ بات سمجھئے بغیر کیوں ہنس دیتے  
ہیں۔ آگے ایک فلیٹ کے دروازے پر ایک عورت اپنے بیٹے کو اسکوں  
کے لئے رخصت کر رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

”نظام بابا! اتنے صاف شہرے کپڑے میں کیا لے جا رہے ہو؟“  
میں نے قریب ہر پچ کرا سے بچی دکھائی۔ وہ چلنی سے بولی۔

”اللہ کتنی خوبصورت ہے بس کی ہے؟“

”آپ ہی کی ہے بی بی جی!“

”اے خدا نہ کرے کہ میری ہو۔“ دہ نارا ہن ہو گئیں، لیا مجھے میرے  
میال سے جو تیار کھلنا پڑتا ہے ہو۔ پچ بتا دا سے ہمارا میں نہ دے  
”بی بی جی!“ میں ایک کچھے کا بھی حساب نہیں تھا۔ نکتا کہ دہ کس  
کے لھر سے آتا ہے۔ اس کچرا لھر میں بہت سی قابل نظرت اور شرمناک  
چیزیں آتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔“

میں آگے بڑھ گیا۔ میرے ساتھ ساتھ اس علاقے میں یہ بات  
بھی چھیلتی گی کہ کچرا لھر کے بڑھنے کی گود میں کوئی ایک نوزاں بدھ بھی کہ  
چھوڑ گیا ہے یا چھوڑ دیا ہے۔ میں سوالوں اور جوابوں سے گزرتا ہوا  
پولیس اسٹینشن کے احاطہ میں پہنچ گیا۔ سپاہی نے مجھے اندر نہیں  
جانہ دیا۔ میرے بدن پر گرد و غبار کی ایسی نہیں جی رہتی ہیں کہ لوگ  
بئے دیکھتے ہی ناک سکوڑ لیتے ہیں۔ اتنی تھا سے تھانے کا انچارج  
اس وقت ڈیلوی پر حاضر ہونے کے لئے آرہا تھا۔ میں نے کہا۔

”جناب اکل رات کچرا لھر میں کوئی اس بھی کہ چھوڑ گیا ہے۔  
تھانیدار کی بھویں سکر دیں، نیور بدل گئے۔ اس نے  
غرا کر پوچھا۔“

”ہوں، کوئی چھوڑ گیا ہے یا نہیں دے گیا ہے؟ انداز دو۔“  
”آخر دھی ہوا، جس کا مجھے ٹوڑتا ہے۔ اگر کوئی چوری کامال پا کر دا۔“

کرنے جانے تو تھلے کے دردازے پر پہنچتے ہی خود چور کھلانے لگتا ہے۔ تھا نیدار نے دفتر کے کرے میں پہنچتے ہی میز پر سے بید کی لمبی چھڑی انٹھائی۔ پھر گرج کر کھلا۔

”پسچ پسچ تھا زے — اگر کسی ریس کی بچی ہے تو میں اس سے نکٹ لوں گا۔“

”خباب! یہ کسی بہت ہی مالدار کی بیٹی ہے۔ مگر میں اسے نہیں جانتا ہوں۔“

”ابے جب تو اسے جانتا ہوں ہے تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بہت مالدار ہے؟“

”وہ ایسے معلوم ہوا جی کہ جس باسکٹ میں یہ بچی تھی۔ اس میں پاپک ہزار روپے بھی تھے۔“

”پاپک ہزار — ؟“ تھا نیدار کے ہاتھ سے چھڑی گر پڑی۔ وہ ایک دم سے حفاظت ہو گیا۔ اس نے آس پاس دیکھا کوئی سپاہی بھی نہیں تھا، بلکہ اب کرے میں ایک سپاہی آنا ہی چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔

”تم دردازہ بند کر کے باہر کھڑے رہو۔ میں اس بوڑھے سے بچی کے ماں باپ کا پتہ معلوم کر لہا ہوں۔“

سپاہی نے باہر جا کر دردازہ بند کر دیا۔ تھا نیدار نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

”کہاں ہیں وہ پانچ ہزار؟“

میں نے بچی کو بیسی پر لٹا دیا۔ پھر اپنے میلے چکٹ ادوار کوٹ کی اندر دنی جیب سے پانچ ہزار کی گڈی نکال کر اس کے آگے رکھوئی۔ اس نے لپک کر اس سے اٹھایا۔ مختلط انتظروں سے دوداڑے کی طرف دیکھا۔ پھر نوٹ گٹنے لگا۔ اضطراب کی حالت میں بار بار گنتی بھول جاتا آخراں طرح گڈی کو اپنی جیب میں ٹھوٹتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہی ہوں گے۔۔۔ میں جانتا ہوں تم بہت ایکاندار ہو۔ ایک عرصے سے اس کچرا گھر میں رہتے آ رہے ہو۔ اگر کوئی دوسرا ہونا تو میں اسے حوالات میں بند کر دیتا۔“

”مہربانی ہے جناب! اب میں جاؤں۔“

”ٹھہر میں ابھی رپورٹ لکھوں گا۔ پھر آج کسی دلت اخبارات کے پورٹر اور فوٹو گرافر زمہارے پاس آئیں گے۔ تم ان سے کہنا کہ باسکٹ میں صرف بچی تھی۔ پانچ ہزار کا ذکر نہ کرنا۔“

”نہیں کر دیں گا، اب میں جاؤں۔“

”ہاں۔۔۔ مگر اچھی طرح یاد رکھو، پانچ ہزار کا ذکر کسی کے سامنے نہ کرنا۔ درمنہ میں ہمیں کچرا گھر سے بھکار دیں گا۔“

”نہیں جناب! ایسی غلطی کبھی نہیں کر دیں گا، آپ مجھے دہاں سے نہ نکالیں۔“

”اچھا جائز۔ میں رپورٹ درج کر دیں گا۔“

میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے ڈانٹ کر پچی کی طرف اٹاہ کیا۔

”ابے اس لعنت کو تو انھا کر لے جا۔“

بن نے پڑت کر پچی کو دیکھا۔ پھر پریشان ہو کر لوٹ چکا

”آ۔ آپ ا سے تھا نے میں جمع نہیں کر سکے گے؟“

”تیرا دماغ چل گیا ہے۔ یہ کوئی جمع کرنے والی چیز ہے؟ اٹھا کر لے جا اس حرام کی اولاد کو...“

کیسی عجیب بات ہے، وہ بچی حرام کی سمجھی جا رہی تھی۔ اس کے پسے حرام نہیں تھے۔ تھا نہہ ارنے سپاہی کو دروازہ کھولنے کو کہا۔ میں نے بچی کو اٹھا لیا، زہ کہہ رہا تھا۔

”بچی کی ذمہ داری تھے پر ہے۔ اگر تو اسے کہیں پھینک کا بیا ہماری اجازت کے بغیر کسی کو دے گا تو پھر تھجھے لے کر تیری شامت آ جائے گی：“  
میں بوجھل تدمون سے چلتا ہوا پہلیس اسٹیشن سے باہر گیا  
پائی گئی خرا کا بوجھ سر سے انترگیا تھا۔ اب میں رات کو آرام سے سورکتا تھا۔ صرف وہ بچی مصیبت بن کر چیک گئی تھی۔ اب تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی تھجھے پر غائب کر دی گئی تھی۔ میں بڑا بڑا ہوا اپنے محلے میں داخل ہوا۔ تھجھے دیکھتے ہی آپ سر سے دوسرے سرے تک یہ خبر پھیل گئی کہ نظام بابا بچی کو لیکر والپس آ رہا ہے۔

دکانوں میں لوگ باہر آگئے۔ مکانوں کی کھیڑکیاں دروازے مکھتے

چلے گئے۔ مولود رکشاپ میں کام کرنے والے مجھے دیکھنے لگے۔ زیرِ تعبیر  
بلڈنگ کی سچلی منزل سے پانچویں منزل تک کام کرنے والے مزدور دعد  
ہتھ سے گودکی بچی کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے میں گزرتا تھا وہیں سے  
آدازیں آتی تھیں، کوئی پوچھتا۔

”کیا یہ زندہ ہے؟“

کسی نے مشورہ دیا۔

”اے سے تھانے میں یہاں کر رپورٹ لکھواؤ۔“

کسی نے پوچھا۔

”کون اسے چھوڑ گیا تھا؟ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟“  
میں انھیں جواب دیتا ہوا ایک گلبی میں داخل ہوا۔ ایک عورت  
نے نفرت سے تھوک کر مدد و اذہ بند کر لیا۔ ذرا آگے بڑھا تو ایک  
عورت نے سرگوشی کی۔

”اے ذرا دکھاؤ تو۔“

میں نے کھڑکی کے قریب جا کر اسے دکھایا۔ بچی روئے لگی۔

عورت نے کہا۔

”ہائے کتنی خوب عورت ہے، اسے بھوک لگا رہی ہے۔“

”بی بی جی! آپ کے بچے کا جھوٹا دودھ ہوتا تو دے دو۔ میں  
اسے پلاوں گا۔“

دوسری کھڑکی سے ایک بوڑھی عورت نے کہا

”اے بڈھے بچی کو دو دن تک دعوہ نہ پلانا۔ حرف شہد  
چانے کے لئے دینا۔“

میں جلدی جلدی پھر الگر کی طرف جانے لگا تاکہ شہد منہ میں ٹیکا  
اسے چپ کر اسکوں آگے ایک مکان کا درد اڑہ کھلا۔ ایک مرد نے  
چھوٹی سی شیشی بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لو، اس میں شہد ہے۔“

میں شہد لینے کے لئے آگے بڑھا، اس سے بہلے ہی ایک عورت  
نے اس مرد کا ہاتھ پکڑ کر اسے مکان کے اندر کھینچ لیا۔ ایک دھڑکے  
سے دروازہ بند ہوا۔ پھر اندر سے آداز آنے لگی۔ دہ بول رہی تھی۔

”آپ کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ پچ سچ بتائیے۔ یہ  
آپ ہی کا گناہ ہے نا؟ آپ کی اس چیزی نے اسے جن کر چکیک دیا ہو گا۔  
مرد کی آداز آتی۔“

”بانو! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آہستہ بولو، درجنہ  
چھٹے دلے مجھے پچ سچ ٹکڑا ہگا رسم بھیں گے۔ پولیس والے مجھے گرفتار  
کر کے لے جائیں گے۔“

”آپ میرے سر کی قسم کھا کر کہیں گے آپ ستازیہ سے نہیں طے ہے۔“  
”میں تمہارے سر کی قسم کھا کر کھتا ہوں کر میں نے پچھلے تین ماہ  
سے ستازیہ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔“

میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

”بھائی جی! آپ تین ماہ سے نہیں ملے۔ مگر تین ماہ پہلے تو کمی شازیہ سے ملے تھے۔ یہ بچی تو نوماہ کا سفر ملے کر کے آئی ہے۔ لب میں سمجھ گیا اب باہر آ کر اپنی بچی کو لے لو۔“

میری بات پوری ہوتے ہی دروازہ کھلا۔ دو ہاتھوں نے ایک جھٹکے سے مجھے اندر کھینچا۔ پھر دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ بچی اب تک رور ہی تھی۔ کمی شازیہ کے عاشق نے کہا۔

”یہ لو شہد، پہلے بچی کو چپ کرو۔“

میں نے بچی کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں کیوں چپ کراؤں۔ تمہاری بچی ہے۔ تم سن بھالو۔“  
اس شخص نے مجھے غصہ سے دیکھا۔ پھر اپنی بیوی سے کہا۔

”بانو! ادیکھو تمہارے ذرا سے شبہ نے میرے لئے منیجست کھڑی کر دی ہے۔ کیا تمہارا چینخا کم تھا کہ اب یہ بچی بھی میرے خلاف چیخنے آئی ہے۔ ارے خدا کے لئے اسے چپ کرو۔“

اسے کھلا کون چپ کرتا؟ وہ میری نہیں تھی۔ وہ بانو کی بھی نہیں تھی۔ گناہ کار خود اپنے گناہ کی آواز کو دباتا ہے۔ مجھوڑا شازیہ کے عاشق نے بچی کو بھر سے لے لیا۔ پھر شہد میں انگلی ڈبو کر اس کے چیخنے ہوئے منہ میں ڈال دی۔ بچی فودہ ہی چپ ہو گئی۔ نب بانو نے پاتھ نچا کر کہا۔

”ہاں۔ اب بتاؤ۔ یہ تمہاری نہیں ہے تو تمہارے پاس

آتے ہی جب کیسے ہو گئی۔

اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”خدا کے لئے عقل سے کام لو۔ یہ میرے پاس آگر نہیں، شہد کی مشاہس پا کر چپ ہوتی۔“

”شہر کی مٹھا سس نہیں، اپنے باپ کی مٹھا سس پاکر چپا ہے۔  
آپ مجھے بیوقوف نہیں بنایا سکیں گے۔“

شوہر نے بڑی بے لبی اور عاجزی سے کہا۔

۱۰۔ میری شریکِ حیات! اگر تم میری زندگی کی ساتھی ہو تو میری  
جان کی دشمن نہ ہو۔ ذرا عقل سے کام لیں کر یہ بتاؤ کہ یہ بات ابھی گھر کی  
چار دیواری سے باہر جائے گی، اور لوگ مجھے گناہ کار سمجھ کر مجھے پھر ماریں  
گے۔ مجھے منزرا پیش دی جائیں گے۔ میری بے عزتی ہو گی۔ اور مجھے جان سے  
مارڈا لاجائے گا۔ تو کیا تم بیوہ ہو کر زندگی گزار سکو گی؟“  
بانو گھر گئی۔ ذرا ہمچنانے ہرے ہو لی۔

”مجم“ میں باہر والوں کو بولنے نہیں جا رہی ہوں۔ گھر کے اندر ہی اپنے نہیں ہوں کو درجی ہوں۔ ”

”تم اپنے نصیبوں کو درہی ہوا یہ نہیں سمجھتیں کہ یہ نظام  
بaba رجھی گھر سے باہر جا کر سارے محلے میں ڈنکا پیٹنا شروع کر دے گا۔  
کہ یہ بھی میری ہے۔ تب کیا ہو گا۔؟“

شب بانو کو جیسے عقل آگئی۔ اس نے گھوڑ کر میری جانب پر

دیکھتے ہوئے کہا۔

"اے، اس کی کیا مجال ہے، یہ تو ہمارا چینکا ہوا کھاتا ہے، ہمارا کھانے کا درہم ہی پر غرّتے گا؟ والپس کرو اس کی بچتی..."

اس نے بچتی کو والپس کیا۔ میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بے اختیار میرے ہاتھ آپ ہی آپ آگے بڑھ گئے۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ برسوں سے مجھے کچرا سمجھنے کی عادت تھی۔ جب بھی کوئی کچو چینکتا تھا۔ میرے دنوں ہاتھ آگے بڑھ جاتے تھے۔ اس لئے میرے بڑھے ہوئے دونوں ہاتھوں میں وہ بچتی والپس آگئی۔ بچھرا اس سے پہلے کہ میں احتیاج کرنا۔ دروازہ دبایا کھلا۔ مرد نے مجھے باہر دھکایا۔ خورست نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔

"بڑھے خبیث اخباردار! اگر کسی سے کچھ کہا۔ اور میرے ستر تلاج کو بننام کرنے کی کوشش کی تو تجھے کچرا اگر سے سہکا دوں گی۔ بچھر تجھے بھیک مانگنے سے بھی اتنی ردیاں نہیں ملیں جی، جنہی کہ اس محلے سے مل جائیا کرتی ہیں۔ چل جا، اب پہاں سے بھاگ جا..."

میں پہاں سے بھاگ آیا۔

جب میں کچرا گھر میں پہنچا تو دہان لوگوں کا هجوم نہ تھا۔ حرف مردہ میں مرد نظر آرہتھے۔ اگر ایک عورت گناہ کرتی ہے۔ تو دوسروں عورتیں بھیر لڑ نہیں لگاتیں۔ شرم انھیں روکتی ہے۔ مردوں کو شرم کبھی نہیں روکتی۔ دہ پوچھنے چلے آئے تھے کہ بھی کس کی ہے۔ میں نے کہا۔

”اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو یہ بھی اسی کی گود میں نظر آتی۔ میں کیا بتاؤ کہ یہ آپ لوگوں میں سے کس کی ہے؟“

یہ بات سنکر لوگوں کے منہ بن گئے۔ میں نے کہا۔

”یہ برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ یہ انسان کی بھی پے اور آپ سب انسان ہیں۔ اس رشتے سے کہتا ہوں کہ یہ آپ کی پے۔ آپ کا نہیں ہے تو آپ کے کسی بھائی کی ہے۔ اسے آپ اس کے ماں باپ تک نہیں پہنچا سکتے۔ اگر یہ مہاں تک پہنچ سکتی تو اسے یہاں پہنچانے

دلے چھوڑ کر نہ جاتے۔ اب تو ہمدردی اور محبت والی بات ہے کسی کے دل میں النانیت کا نہ ہے تو آگے بڑھ کر اسے گودیں اٹھائے۔ ”  
میری بات سنکر ایک صاحب لاحول پڑھتے ہوئے چلے گئے۔

کسی نے ہمدردی سے کہا ۔ ” بے چاری۔ ”

کسی نے نظرت سے ”ادنہہ“ کہا۔ کسی نے مجت سے آہ بھری۔  
کھینی سے آواز آئی۔

”غلاظت کی پوت کوون ہاتھ لگائے سگا۔ یا“  
کسی نے پیش گوئی کی۔

”قیامت قریب ہے۔ ”

اور قیامت اس طرح قریب تھی کہ ایک دیجھلے اور چاٹ دالا  
میں بعد کے گاڑک چھوڑ کر انپی بارہ مسالے کی ٹکاری کچرا گھر کی طرف  
لے آیا تھا۔ ایک موگن چھلی والا آوازیں لگا رہا تھا۔ دلڑکے ادھر  
سے ادھر کھو منے ہوئے پان اور سگریٹ فروخت کر رہے تھے۔ ایک  
بوڑھے نے چائے کی چلتی پھرتی دکان کھول لی تھی۔ لوگ خرید رہے تھے  
کھارہے تھے۔ پیار ہے تھے اور قیامت کی پیش گویناں کردہ ہے تھے۔

شام تک بڑی چہل پہل رہی۔ لوگ آتے رہے اور جلنے  
رہے۔ پھر پولیس والے آگئے۔ ان کے ساتھ بہت سے پریس روڑز  
اور فوٹو گرافر فرز تھے۔ میں فوراً ہی بھی کو کچرے میں لٹا کر کچرا گھر کے اندر رہا۔  
دہاں آئئے کا ایک مکڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی بھی تھی میں اپنے

بال سنوارنے لگا۔ اور کوٹ کی آسٹین سے چہرے کو گرد گز کر پوچھنے لگا۔ بڑی مدت کے بعد کچھ لوگ میری اور میرے کچرا گھر کی تصویریں اتارنے آئے تھے۔ جب میں اچھی طرح نیارہونے کے بعد پچھی کے پاس واپس آیا تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔  
 ”تم نے کس وقت اس بچی کو یہاں پایا تھا؟“  
 میں نے جواب دیا۔

”جناب! آدھی رات کے بعد میں نے اس محضوم کے پیچنے کی آواز سنی۔ اس کچرا گھر سے باہر جھانک کر دیکھا تو ایک گارڈی گھوتی ہوئی اس طرف جا رہی تھی۔ اس وقت بچی زندگر سے رورہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر پیچنے لگا۔ آوازیں دینے لگا۔ لیکن وہ سنگرل میری آدا کی پہنچ سے دیر چلے گئے تھے۔“  
 یہ کہہ کر میں نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر مسکراتے ہوئے پوز بناؤ کر کھا۔

”ہاں تو جناب! میں نیارہوں۔ آپ تصویریں اتاریں...“  
 فوٹو گرافر نے کہا۔

”ہم تصویریں اتار جکے ہیں۔“  
 میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”لیکن میں تو ابھی آبھا ہوں۔ ابھی میں نے بچی کو گود میں لیا ہے اب آپ تصویریں اتاریں۔!“

میری باتیں سنکرہ سب نہیں لگتے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔  
 ”ہمارا سمجھٹ یہ نوزا تبدہ بچی ہے۔ تم نہیں ہو۔ جو ہمارا  
 موجود ہے، ہم اس کی تصویریں لے چکے ہیں۔“  
 میں نے کہا۔

”جانب بامیں بھی سمجھٹ ہوں بلکہ بہت بڑا سمجھٹ ہوں۔ ایسے  
 وقت جب کروگ اس بچی کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتے۔ اسے  
 گناہ کی پوٹ سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہ انسان ہے اور لوگ اسے انسان  
 نہیں سمجھتے۔ میں اسے اٹھا کر کلیج سے لگا رہا ہوں۔ رات سے  
 اب تک اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔ ایک بارپ کی طرح، ایک ماں  
 کی طرح، اس کے ماں بارپ کی طرح نہیں جو اسے جنم دیئے کے بعد ایک  
 سمجھٹ بنا کر حنپڑ گئے ہوں، اگر میں نہ ہوتا تو پچھلی رات آپ کا یہ  
 سمجھٹ سردی سے ڈھنڈ کر مراجاتا۔“

انھیں توقع نہیں تھی کہ مجھ چیسا کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں رہنے  
 والا بوڑھا ایسی ممتازت اور ذہانت سے بول سکتا ہے۔ وہ مجھے حیرانی  
 سے دیکھ رہے تھے۔ اور میری باؤں کو نوٹ کر رہے تھے۔

پھر ایک نے پوچھا۔

”تھاری گفتگو کے پیچے ایک اچھی تعلیم بول رہی ہے۔ کیا  
 تم تعلیم یافتہ ہو؟ کون ہوتا؟“

”میں آپ کی طرح ایک انسان ہوں۔ اور اس نئی سی بچی کی طرح“

اس دنیا کا ایک فالتو سامان ہوں ۔۔۔ دش برس پہلے حالات نے مجھے بھی اس کچرا گھر میں پھینک دیا تھا۔ اس وقت میں پچھن پرس کا تھا اب میں پہنچو برس کا ہوں ۔۔۔ اس وقت میں نظام الدین ایم۔ اے آنزو کہلاتا تھا، اڑ دو لڑی پر کا معلم تھا۔ اب میں نظام بابا کہلاتا ہوں۔ اور اس کچرا گھر میں ایک طالب علم کی طرح کچرے کی زبان پڑھ رہا ہوں۔ ”

کچھ دیر پہلے وہ مجھ پر نہیں رہے تھے۔ اب حیرانی سے نہ کھولے مجھے دیکھ رہے تھے اور بڑی بے یقینی سے کہہ رہے تھے۔

”تم ایم۔ اے آنزو تھے؟ نہیں....”

”تم اڑ دو لڑی پر کے استاد تھے؟ نہیں....”

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ تمہارے جیسا قابل آذنی پہاں کیسے آ سکتا ہے؟“

”کیسے نہیں آ سکتا۔۔۔“ میں نے کچرے میں سے ایک لوٹی ہوتی پچکی ہوتی گڑیا کو اٹھا کر کہا۔۔۔ ”یہ کیسے آگئی؟ جب یہ گڑیا سکھل تھی تو کسی صاف سترے گھر میں کسی بھی کی گود میں رہتی تھی۔۔۔ پھر یہ پرانی ہو گئی اور لوٹنے اور پچکنے لگی تو نئی گڑیا خرید کر اسے پھینک دیا گیا۔ وہ دیکھو وہ جو لوٹی ہوتی بوتل ہے۔ اس میں دعا آتی تھی۔ اس بوتل کا منہ درعا کی طرح کھلتا تھا۔ اور بیماروں کو شفا دیتا تھا۔۔۔ جب شراب پر پاندی ہوتی تو ایک شرابی نے قانون کی آنکھوں میں دھعل

جو نکنے کے لئے دوا کا لیبل رہنے دیا اور اس کے پریٹ میں شراب بھردی۔ پھر اس بوتل کا منہ گالیوں کی طرح گھلنے لگا۔ ایک رات وہ یہاں سے پیتے ہوئے گزر رہا تھا۔ جب یہ بوتل خالی ہو گئی تو اس نے بوتل کو ایک گندی سی گالی دی۔ پھر کچھ اگھر کی دیوار پر اسے زور سے دے مارا یہ ٹوٹ گئی۔ یہ جو بیماریوں سے لوٹنے والوں کو جوڑتی تھی، اسے ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔

مجھ سے یہ نہ پڑھو کہ میں تعلیم کی ایک ایک خوراک دوا کے طور پر دینے والا معلم کس طرح ٹوٹ کر یہاں آگیا۔ یہاں کی تمام لوٹی چھوٹیں چیزوں کے سچھے انسان کی کتنی ہی نازی باہر کتیں، خود غرضیاں اور مکاریاں چھپی ہوتی ہیں۔ میں صرف انسان ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ انسان کو جو چیز ناپسند ہوتی ہے۔ اسے دہ کھرے میں پھینک دیتا ہے۔ خواہ دودھ کی بوتل ہو، گود کا بچہ ہو یا پرانی نسل کا بوڑھا ہو۔“

وہ لوگ میری بانوں کو لکھتے جا رہے تھے مجھے انہی اور کچھ اگھر کی تصویریں اتروانے کا شوق تھا۔ ملکراپنے دل کی گھرائیوں سے جو بائیں مکمل رہی تھیں۔ ان سے میرے ماضی کا ذخیرا ہو گیا۔ میرا دماغ پھونڈ کی طرح ڈکھنے لگا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کتنے ہی سوالات کئے۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ انہوں نے مختلف زاویوں سے تصویریں دوبارہ اتاریں۔ پھر میری بیزاری سے خاموش ہو کر چلے گئے۔

رات آئی تو لوگوں کی بھیر چپٹ گئی۔ اس رات میں نے کچھ نہیں کھایا۔ میرا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ماضی کے کچھ میں جھانک کر خوب آنسو بہاؤں۔ لیکن اس نوزاںیدہ بچی کی وجہ سے آنونسل نہ کیا جی زصت نہیں مل رہی تھی۔ اس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بچی کی کہانی تجسس اور اسرار لئے کتنی درد تک جائے گی۔ کچرا گھر کے آس پاس سناٹا ہو جانے کے بعد یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اب صبح تک کوئی مجھے پر نیشان کرنے نہیں آئے گا۔ لیکن یہ تو رات ہی کا وقت ہوتا ہے، جب گناہکار منہ چھپا کر نکلتے ہیں۔

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر۔ تب میں نے ماں کی  
کار بیچ کھولنا چاہا۔ اسی وقت بچی روئے لگی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ پتھر نہیں  
نہ زانی بچے دن رات میں کتنی بار شہد چاٹنا چاہتے ہیں، میں نے پھر  
شہد میں زنگی ڈبو کر اس کے منہ میں ڈال دی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے چپ  
ہوئی۔ دوسرا لمحہ پھر روئے لگی۔ میں نے اس کے منہ میں کچھ اور  
شہد ٹپکایا۔ پھر بھی وہ خاموش نہ ہوتی۔ میں اسے اٹھا کر نہیں لے سکتا۔  
اسے سمجھانے اور منانے لگا۔

جانے وہ کس ضدی باپ کی بیٹی تھی۔ چپ ہونا ہی نہیں چاہتی  
تھی۔ رات کی تاریکی اور خاموشی میں ہیچ جنگ کراپسول کو پکار رہی تھی  
اور اپنوں کی پکار پر اپنے ضرور آئے ہیں۔ میں نہ دیکھا کچھ اگھر تھے  
ذرا فاصلے پر وہ چادر میں منہ چھپائے کھڑی تھی اور بار بار ادھر ادھر

سرگھا کر سہے ہوئے انداز میں دیکھ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں  
رہا۔ صحیہ؟

میں فوراً ہم سمجھ گیا کہ وہ شازیہ ہی ہو سکتی ہے۔ وہی شازیہ  
جس پر بانو کا شوہر عاشق تھا۔ اور ان دونوں کے عشق کے انعام  
پر وہ بھی رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا  
”کون ہوتا ہے؟“

وہ آگے بڑھی۔ ذرا لٹکھڑائی۔ پھر میرے قریب پہنچ کر  
سردی سے یا پھر خوف سے کانپتے ہوئے بولی۔

”بھی کو مجھے دو۔ میں اسے چپ کرانے کے بعد لے آؤں گی۔“  
”کیا یہ بھی تمہاری ہے؟“

”نہیں، میری نہیں ہے۔ دیر نہ کرو۔ مجھے دو۔!“

”تمہاری نہیں ہے تو نہیں کیوں دوں۔ تم اسے کہاں  
لیحا کر چپ کرائے گی۔؟“

”میں اسے گھر لے جاؤں گی۔ دیکھو بحث نہ کرو کوئی آجائے  
گا۔!“

”تھانیدار صاحب نے کہا ہے کہ جو بھی کو لینے آئے میں  
اسے تھانے لے آؤں۔ تم تھانے میں چلو گی۔؟“

وہ منہ پھیر کر جانے لگا۔ میں نے اس کے پیچے چلتے ہوئے پوچھا۔

”کیا اسے چپ نہیں سزا دی گی۔ ڈرتی بھی ہوا در بھی کے لئے“

مرتی بھی ہو۔ یہ کسی محبت ہے؟“  
 دہ خاموشی سے چلتی رہی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کا زوں  
 پر رکھ لئے تھے۔ تاکہ بچھی کے رو نے کی آداز سنائی نہ دے۔ مگر  
 کوکھ سے اٹھنے والی چینیں ماں کے کھجھے میں چھپ رہی تھیں۔  
 اس نے تیزی سے پلٹ کر بچھی کو مجھ سے چھین لیا۔ کھروہیں سڑک  
 کے کنارے دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے دوسری طرف  
 منہ پھیر لیا۔ چند لمحے بعد ہی بچھی خاموش ہو گئی۔ لیکن بالکل ہی  
 خاموشی نہیں تھی۔ اب ماں کی سسکیاں اور آہیں سنائی  
 دے رہی تھیں۔

یہ ہماری دنیا میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ بچے چپ ہو جاتے  
 ہیں تو ماں میں رو نے لگتی ہیں۔ چشمہ بہتا ہے تو اس کی لہڑی سے ترم  
 ہپوٹتا ہے۔ ماں کی چھاتیوں سے دودھ بہتا ہے تو آہوں کے سر  
 جا گتے ہیں۔ میں نے پوچھا

”جب اپنی تخلیق کو مٹانا ہی تھا تو اسے جنم کیوں دیا؟ اور  
 جب مٹانے کے لئے چھوڑ ہی دیا تھا تو اسے دودھ پلانے کیوں  
 آگئیں؟“

وہ آہتگی سے بولی۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو، یہ میری بچی نہیں ہے۔“  
 ”تم غلط کہہ رہی ہو، یہ تھماری ہے، اور تمہارا نام مشا زیر ہے۔“

یہاں فلیٹ نمبر ایف را کاسی میں پانو نام کی ایک عورت رہتی ہے، اس کے شوہر سے تمہارے ناجائز تعلقات رہے ہیں۔"

"بکواں مت کرو۔" وہ حصہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں کسی پانو کو ادراس کے شوہر کو نہیں جانتی۔ پتہ نہیں تم کس شازیہ کی بات کر رہے ہو۔ میرا نام شازیہ نہیں ہے۔ میں نے کسی ناجائز بچے کو حنف نہیں دیا۔ میں ایک بیانہ عورت ہوں۔"

"بہت خوب بیانہ تھا ہو۔ اب میں آگے سوال کروں گا تو تم جواب میں کہو گی کہ تمہارا شوہر اور تمہارا بچہ کھریں ہیں۔ تم متمام سے مجبور ہو کر یا انسانی ہمہ دردی کے تحت ایک لاوارث بچی کو دودھ پلانے آئی ہو۔"

"تم لقین کرو۔ یہی بات ہے۔ میں صبح سے بچی کے بارے میں سن رہی تھی اور ترٹ پر ہی تھی کہ پتہ نہیں کس ماں نے اپنے جگر کا چکڑا پھینک دیا ہے۔ ابھی میں نے سوتے کی کوشش کی مکر نہیں۔ نہیں آئی۔ مجبوراً اپنے بچے کے حصے کا دودھ اسے پلانے آگئی۔" دوسرے تمہاری بات کا لقین کر سکتے ہیں، میں نے تو کچرا گھر میں بیٹھ کر یہی دیکھا ہے کہ کوئی اپنے حصے کا کھانا دوسرے کو نہیں دیتا۔ بلا سے نکجج جائے تو پھینک دیتا ہے۔ اور ایسی ماں تو کہیں نہیں دیکھی، جو اپنے بچے کے منہ سے دردھ جھڑا کر پرانے بچے کے منہ میں دے۔ مجھے پچ بتاؤ دندن بچی کو چین کر لے جاؤں گا۔"

دہ خاموش رہی، شاید مجھے گھور رہ دیکھ رہی تھی۔ اندر چیرے میں اس کی آنکھیں نظر نہیں آرہی تھیں، میں نہ کہا۔  
”اگر تم گتا ہنگار نہیں ہو تو پولیس والوں کا نام من کر گھبرا کیوں گئیں؟“

”میں یہ بدنامی لینا پسند نہیں کرتی کہ میں نے کسی لاوارث بھی کو روڈھو پلا پایا ہے۔“

”یہ بدنامی نہیں، بہت بڑی انسانیت ہے۔“  
”دنیا دا لے انسانیت کو نہیں سمجھیں گے، وہ مجھے زبردستی بھی کی ماں بنادیں گے۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی اندر چیرے سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”کنیز! یہ کیا حادثت ہے۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ کہیں چھپ کر بھی کو روڈھو پلا دینا۔ مگر غم سڑک کے کنارے.....“  
کنیز نے جلدی سے بھی کو میری گود میں واپس کرتے ہوئے اس آنے والے سے پوچھا۔

”میرا بچہ کہاں ہے؟ آپ اسے کہاں چھوڑ آئے ہیں؟“  
میں نے اندازہ لگایا کہ دکنیز کا شوہر ہے۔ اور دکنیز اس کا گریبان پکڑ کر اپنے بچے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس نے کہا۔

اطمینان رکھو! بچہ گھر میں سورہا ہے۔ میں نے باہر سے تالا

لگا ویلے ہے۔"

"نہیں۔ میرا بچہ لادارٹ نہیں ہے کہ آپ اسے بے سہارا چھوڑ آتے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو....." اس کی آواز لگتگئی۔ شاید اس کے شوہرنے نہ پہنچا تھا رکھ دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"آہستہ بولو۔ رات کے وقت آواز دور تک جاتی ہے۔" میری کمزور لگا ہوں کے سامنے دوسارے جیسے ہاتھا پائی میں مصروف تھے۔ کنیزا پنے بچے کے لئے نڑپ رہی تھی۔ پھر وہ خود کو چھپڑا کر بھاگنے لگی۔ مرد اس کے پیچے دوڑا، پھر کبھی بھاگا۔ اس نے دالپس آکر مجھ سے پوچھا۔

"بچی کا پیٹ بھر گیا ہے نا؟ یہ سوگئی ہے نا؟ ہاں آواز تو نہیں آرہی ہے۔ دیکھو اس کی ابھی طرح حفاظت کرنا، سردی سے بچا کر رکھنا۔ اس کے ساتھ جو پانچ ہزار روپے کے گئے تھے اس کا حساب میں بعد میں آکر کروں گا۔"

یہ کہتے ہیا وہ بھی اپنی بیوی کے پیچے بھاگتا چلا گیا۔ ان دونوں کے جاتے ہی پھر وہی سنتا ٹا جھاگیا۔ کچھ دیر پہلے جو کردار سلمانے آئے تھے۔ وہ تاریکی میں مٹ چکے تھے۔ لوگوں کو دن کے اچالے میں پچھے بھی میں نہیں آتا۔ پھر بھلارات کی تاریکی میں اتنی جلدی یہ حقیقت کیسے واضح ہو جاتی کہ وہ دونوں بیاں بیوی کوں

نہے؟ اور گھر میں جائز بچپہ رکھ کر ناجا تنبی کو دودھ پلانے کیوں آتے  
نہے؟

میں اس نبھی سی جان کو سینے سے لگا کر کھرا گھر میں دالپ آگیا۔  
اسے حملکتی ہوئی سیع پر لٹا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ باہر اندر ھیرے میں  
دیسرے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ شاپر چھر کوئی آجائے۔

کوئی اور تو نہیں آیا۔ باہر کی تاریکی میں خود ہی نظر آیا۔ میں بعثت  
ہی صاف ستمبرے لباس میں تھا۔ میری عمر چھیں برس تھی۔ مردی کی راتوں  
میں لوگ لحافوں میں دیکھ کر انہی کسی محبوہ کو یاد کرتے ہیں یا مخش  
کتابیں پڑھتے ہیں۔ میں لحاف اور ٹھیکانے لفیقات کی خشک کتاب پ  
پڑھ رہا تھا۔ میری شفیق ماں دودھ کا گاہ اس لیکر میرے گرے میں  
آئی اور کھنے لگی۔

”بیٹے! اب شادی کرو۔ بیوی آئے گی تو اتنی رات تک جاگ  
کر تمہاری خدمت کرے گی۔“

میں نے کتاب کا ایک ورق اٹھایا ہوئے کہا۔

”میں امیں کئی بار کہہ جکتا ہوں کہ مجھے شادی بیاہ سے دل چیپی ہیں  
ہے۔ میری دل چیپی کا مرکز صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک تو کتاب (بیر) اور  
دوسرے اسکول کے بچے۔ میں ان معصوم بچوں کی دنیا میں اپنی زندگی  
گزارنا چاہتا ہوں۔“

”بیٹے! جب تمہاری بیوی آئے گی اور تمہارے بچے ہوں گے تو

پھر تھارے یہ خیالات نہیں رہیں گے۔ اپنے بچوں کے سامنے تم دکھرے بچوں کو بھول جاؤ گے۔"

"یہی تو بڑی بُرانی ہے کہ ہم اپنے بچوں کے آگے دوسرے بچوں کی خوبصورتی کو، ان کے معصوم جذبات کو اور ان کی اہمیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اُمیں کسی کو خاص طور سے اپنا نہیں بناؤں گا تو مجھ میں خود غرضی نہیں ہوگی۔ تب ساری دنبا کے بچے میرے اپنے ہوں گے۔ بلکہ اپنے ہیں۔ آپ مجھے صرف ایک پیوی اور چند بچوں تک محدود نہ کریں۔"

میری اُمی بڑھاتی ہوئی چلی گئیں۔ جب تک وہ زندہ رہیں مجھ سے بحث میں شکست کھاتی رہیں۔ لیکن مرتبے وقت انہوں نے یہ کہہ کر مجھے شکست دے دی کہ میں جب تک شادی نہیں کروں گما، ان کی روح بیقرار رہے گی۔

ان کی اذناں کے ایک سال بعد میں نے شادی کر لی۔ ناہید دلہن بن کر آئی تو تپہ چلا کہ زندگی کا دوسرا رخ کتنا حسین اور زیگیں ہے۔ میں نے اسکول سے کبھی چھٹی نہیں لی۔ اکثر بیمار ہونے کے باوجود بچوں کو پڑھانے چاتا تھا۔ ناہید کی قربت سے پہلی بار دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے کچھ روز اسکول سے چھٹی لے کر ناہید کی زلفوں کے سامنے میں وقت گزارنا چاہیے۔ میری راتیں کتابیں پڑھنے گزرتی تھیں۔ شادی کی دو پہلی رات اپنی شرکی حیات کو پڑھنے گزر گئی۔

جمع کے پانچ بج رہے تھے۔ پھولوں کی سیع چہک رہی تھی۔ ناہید کے بدن سے حنا کی خوبصورت رہی تھی۔ ایسے وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے پیار سے کہا۔

”ناہید! تمہارے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا مگر حاکم دیکھنا ہی ہو گا۔ میرا کوئی ضرورت مند شاگرد ہو گا۔“

شادی کی پہلی رات عورت گونگ ہوتی ہے۔ اُسے کوئی بات ناگوار گز رے، تب بھی وہ صبر کر لیتی ہے۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ دوسرے کمرے کا در دروازہ کھولنے کے بعد ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ میرا شاگرد نہیں تھا۔ کوئی اجنبی لڑکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔

”سر! میں فرست ایئر کا طالب علم ہوں۔ آج مجھے کمپیوٹری کا پڑھہ حل کرنا ہے۔ میری کتاب کا ایک درج پھٹ کر کہیں تم ہی ہے۔ آپ کی بڑی ہر رانی ہو گی۔ اگر آپ ہائیڈر وجہ کے چند خواص مجھے بتا دیں۔“

میں نے کہا۔

”اندر آجائو! ایک سپاہی اپنی جان سے زیادہ اپنی تلوار کی حفاظت کرتا ہے۔ کیونکہ وہی تلوار اس کی جان بچاتی ہے۔ ایک طالب علم دل سے اپنی کتابوں کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ وہی کتابیں اسے انسان بناتی ہیں۔ مجھ سے کچھ پوچھنے اور سیکھنے سر پہلے وعدہ کرد

کر آئندہ اپنی جان سے زیادہ کتابوں کو عزیز رکھو گے۔"

"میں دعده کرتا ہوں۔" وہ اندر آگرا یک کرسی کا بھٹکا گیا۔

میں نے کہا۔

"بُرخوردار بِالناسِ نوں کی فرداً فرداً ایک کمر وری ضرور ہوتی ہے۔  
مگر سماجی اجتماعی اور قومی کمر وری یہ ہے کہ ہم نے رسول خدا کی دی ہونی  
کتاب ایک نادان طالبِ علم کی طرح گم کر دی ہے۔ یاد رکھو! جو شخص  
یا جو اہلِ مذہب اپنی نیبادی کتاب کھو دیتے ہیں، یا فراموش کر دیتے  
ہیں، وہ سوالی بن کر دوسروں سے پوچھتے پھرتے ہیں، اور دوسروں کے  
طور طریقوں پر چل پڑتے ہیں۔

ہاں، تو تم ہائیڈ رو جن کے خواص معلوم کرنے آئے ہو، چلو  
نوٹ کرو۔ یائید رو جن کیس بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ ہوتی  
ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے اور دن کے لحاظ سے  
ہوا کا ہر حصہ ہے۔ چونکہ یہ پانی میں بہت مشکل سے حل ہوتی ہے۔ آس  
لتے پانی پر اس گیس کا ذخیرہ کیا جاسکتا ہے۔ اور ٹھنڈک اور دباؤ کے  
زیر اثر سے مائع اور ٹھووس حالت میں لا یا جاسکتا ہے۔"

وہ لکھتا چاہ رہا تھا۔ میں بولتا چاہ رہا تھا۔ جب میں علم کے خزانے  
کو اپنے سینے سے بچوں کے سینے میں منتقل کرتا ہوں تو ایسے وقت  
ساری دنیا کو اور سارے رشتہوں کو بچوں جاتا ہوں میں بچوں کے  
عالمی سال میں اپنی طرف سے یہی کچھ سکتا ہوں کہ ہم خود غرضی کو کینہ پروری

کو اور اپنے پرائی کی تفریق کو بھول کر ہی بچوں کو ایک صحت مند دنیا  
تخفہ کے طور پر دے سکتے ہیں۔

دو دنوں تک ناہیں چبپاپ تما شہری بھی رہی۔ بھرپوں  
کے خلاف بولنے لگی۔ کیونکہ پڑھنے والے بچے جوانی کے دن اور  
امنگوں کی آدھی آدھی رانیں مجھ سے لے لیتے تھے۔ دن کو میں اسکوں  
ھلا جاتا تھا۔ اور رات گئے تک محلے پر دس۔ کے شاگرد کبھی پڑھنے  
اور کبھی کچھ پوچھنے چلے آتے تھے۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی ناہیں پچھلے  
پڑی۔!

”یہ گھر ہے اسکوں نہیں ہے۔ آپ بچوں کو پہاں آنے سے  
منع کر دیں۔“

”ناہیں! یہ گھر اور اسکوں کی بات نہیں ہے۔ نماز اور کتاب  
کہیں بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ آخر تم ناراض کیوں ہوتی ہو؟ آدھی  
رات کے بعد سے صبح تک میں تمہارا ہی ہوتا ہوں۔“

”آدھی رات کے بعد اُلو جاتے ہیں۔ میں جاگ کر حجت نہیں  
کر سکتی۔ آپ کی زندگی بچوں کے ساتھ گذر رہی تھی، پھر مجھے اس  
جہنم میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تجھب ہے! تم بچوں کی پیار بھری دنیا کو جہنم کہہ رہی ہو۔ اگر  
شم چاہتی ہو کہ میں ساری عمر تمہاری عزت کرتا رہوں تو تم بچوں کی قدر  
کر د۔ تم بھی انھیں کچھ نہ کچھ سکھایا پڑھایا کرو۔“

لیکن ناہید نے مجھ سے تعاون نہیں کیا۔ ایک ماہ بعد میں نے رفتہ رفتہ یہ دیکھا کہ سچے میرے دروازے پر کچھ لوپ چھٹے اور سیچھٹے نہیں آتے ہیں۔ بچوں کو میں نے فرداً فرداً پھر طکر لے چکا۔  
”بھائی میرے لھر کیوں نہیں آتے ہو۔؟“

جواب ملا۔

”ماسٹرنی صاحبہ غصہ کرتی ہیں۔“  
میرے تمام شاکر د ناہید کو ماسٹرنی صاحبہ کہتے تھے۔ میں نے لھر اکر پہلی بار ناہید کو غصہ دکھایا۔ اس نے بھی پہلی بار غصہ سے کہا۔

”آپ مجھے سمجھا کر نہیں لائے ہیں۔ باقاعدہ نکاح پڑھا کر میر اگھر بیان نے کے لئے پہاں لائے ہیں۔ یہ میر اگھر ہے۔ میری مرضی کے بغیر آپ کے وہ کٹرے مکوڑے پہاں نہیں آئیں گے۔“  
وہ چیخ چیخ کر لول رہی تھی۔ میں بے عزّتی کے ڈر سے سہم گیا۔  
 محلے میں میری بڑی عزّت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری لھردالی کی آواز باہر دالے سنیں۔ میں نے کہا۔

”آہستہ بولو۔ پہاں سے اسکول تک میری عزّت ہے۔  
چھوٹے بڑے سب ہی بچے ماسٹر صاحب کو گھر سلام کرتے ہیں۔“

”میرے بھائی جان کو تو شہر کے تمام دلخند اور تمام پولیس فران

سلام کرتے ہیں۔ اگر وہ ڈی-سی نہ ہوتے اور چار برس پہلے آپ کو اسکول میں ملازمت نہ دلوائے تو یہ عزّت کہاں سے ملتی؟ لوگ آپ کی قابلیت کی وجہ سے نہیں، میرے بھائی جان کی وجہ سے سلام کرتے ہیں۔“

وہ اس شہر کے ڈی-سی طفیل احمد کی سگی بہن نہیں تھی۔ اگر سگی ہوتی تو اتنا بڑا سرکاری افسر ایک غریب اسکول ماسٹر کو اپنا بہنوئی نہ بناتا۔ ناہید سے بہت دور کا رشتہ تھا۔ چونکہ وہ ایک اعلیٰ افسر اس لئے ناہید اسے بھائی جان کہنے میں فخر محسوس کرتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے بھائی جان کی سفارش سے نہیں اپنی صلاحیتوں کے باعث اسکول کی ملازمت ملی ہے۔— چار برس سے اسکول میں میرا یہ روکار ڈھے کہ میں نے کسی نااہل بچے کو امتحان میں پاس کرنے کے لئے نہ تو بڑے لوگوں کی سفارش پر توجہ دی ہے اور نہ ہی کبھی رشوت قبول کی ہے۔ ایمانداری سے تعلیم دینے کے لئے سب سے پہلے معلم کو اپنا نذر نہنا چاہتے۔ میرے بعد کا کرم ہے کہ میں اتنے صاحبِ ایمان ہوں۔ اور آئندہ بھی رہوں گا۔“

ناہید نے اس وقت میری ہات کا جواب نہیں دیا۔ ”ادنہہ“ کہہ کر بادرپی خانے میں چلی گئی۔ جب وہ رات کو سونے کے لئے آئی تو اس کا غصہ دھل چکا تھا۔ وہ میری آغوش میں پیارہ محبت کی باتیں کرتی رہی۔ نہ اس نے مہنگائی کی ہات چھیڑی۔ پھر یہ ثابت کیا کہ میری تنخوا

میں اچھی طرح گزارا نہیں ہو گا۔  
میں نے پوچھا۔

”تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ دوسرا بیٹھڑا اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد ناضل وقت میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔ اور نامذہ آمدنی کے لئے ٹیوشن فیس لیتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں تمحیق ہوں کہ جب مجھے پڑھانے کے عوض اسکول سے تنخواہ مل جاتی ہے تو پھر مجھے ناضل وقت میں بچوں کو مفت پڑھانا چاہیے بتا بیس، کاپیاں ہنگی ہیں، تعلیم کے اخراجات اتنے زیاد ہیں کہ بچوں سے مزید ٹیوشن فیس لینا طبع ہے۔“

”سارے جوان کے لوگ ختننا کرتے ہیں، اس سے کچھ زیادہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے اچھا کھانے اور اچھا پہنچنے کے لئے اور کھریں اچھا آرائشی سامان رکھنے کے لئے انسان کو زیادہ کمانا ہی پڑتا ہے۔ اگر میرے میکے سے میرے ملنے والے آئیں تو میں انھیں کھریں کیا دکھاؤں گی؟ ایک ریڈیو تک تو ہے نہیں۔ بیٹھنے کے لئے بادا آدم کے زمانے کی کربیاں ہیں۔ اگر جنہیں کا نہیں تو کم از کم مستعار صوفہ تو ہو ناچاہیے۔ آپ کو ٹیوشن کی فیس لینی چاہیے۔“

”ناہیں! میرے اپنے کچھ اصول ہیں۔ اور مجھے فخر ہے کہ میرے ان اصولوں سے نا دار، یقیناً اور غریب بچوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جو

بیچارے بھاری نہیں ادا نہیں کر سکتے۔ وہ میرے پاس آتے ہیں۔  
کچھ پوچھتے ہیں۔ کچھ سیکھتے ہیں، میں ان سیکھنے والوں کے ساتھ کارڈ باری  
انداز اختیار نہیں کر سکتا؟

وہ تھوڑی دیر زک چپ رہی۔ سوچتی رہی۔ پھر لوٹی۔

”اچھی بات ہے۔ میں آپ کے اصولوں سے اختلاف نہیں  
کروں گی۔ مگر آپ میری ایک بات مان لیں۔“  
میں نے پوچھا۔

”کہو، کیا بات ہے؟“

”آپ کل ہی ڈیسی کے نام درخواست لکھئے کہ آپ ہیڈ ماسٹر  
کے عہدے پر نزقی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ درخواست لکھ کر مجھے دیں۔  
باقی میں سمجھ لوں گی۔“

”کیا سمجھ لوگی؟ تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ ہوں۔ سمجھ گیا۔ تم اپنے  
ڈیسی بھائی جان کے سامنے میری درخواست پیش کر دی۔ اور ان کے  
ذریعہ مجھے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنواروگی۔ دیکھونا ہیدا نہ تو میں  
کسی کی سفارش نہیں ہوں۔ اور نہ اپنے لئے کسی کی سفارش کا محتاج  
رہتا ہوں۔ پھر یہ کہ ہمارے اسکول میں ایک قابل ہیڈ ماسٹر  
 موجود ہیں، میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔“

وہ غصہ سے الگ ہو گئی۔ پرکر لوٹی۔

”پھر آپ زندگی میں کیا کریں گے؟ یوں تو کتنے بلیوں کا بھی

پیٹ بھر جاتا ہے۔ ہم صرف پیٹ بھرنے کے لئے زندہ نہیں ہیں یہ سائنس میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا اور ادنیٰ سطح پر زندگی گزارنا آپ کو اچھا کیوں نہیں لگتا؟"

میں نے جواب نہیں دیا۔ اپنی روٹھی ہوئی نشریک ریاضیات کو نہیں منایا۔ کیونکہ منانے کا مطلب یہی ہوتا کہ میں اس کی غلط باتوں کو تسلیم کر رہا ہوں۔ اگر میں اس سے انجاکرنا کر مجھے اپنے اصولوں پر چلتے تو۔ اور میری آمدی کے مطابق گزارا کرو تو پھر عورتوں کی نظرؤں میں اسے منانا نہیں کہتے۔ وہ کبھی نہ مانتی۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے منہ پھیر کر خاموش پڑے رہے۔ پھر ہماری آنکھ لگ گئی۔

دو دن بعد میرے سُسْرِ حماحِ تشریف لائے۔ انہوں نے آرام سے بیٹھ کر مجھے دنیا کی اور پچ نیچ سمجھائی۔ مثالیں دیں کہ لوگ کس طرح ایکسٹرا آمدی کے ذریعہ کوٹھیاں بنوائیتے ہیں۔ اگر میں غریب بچوں سے فیس لینا پڑے نہیں کرتا تو نہ سہی۔ مجھے تم ازکم انہیں قابلیت کے مطابق ترقی تو کرنی چاہئے۔ میں ایم۔ اے آنر زر ہوں اور آسانی سے ایک اسکول کا ہائیڈ ماسٹر بن سکتا ہوں۔ اگر میں ان کی بات مان جاؤں تو میرا عہدہ بھی بڑھے گا۔ اور زندگی کی دھرمی ہو لتیں بھی میسر ہوں گی۔ ان کی بیٹی گھٹ گھٹ کر زندگی نہیں گزارے گی، میں نے ان کے سامنے بھی صاف صاف کہہ دیا۔ میں ہائیڈ ماسٹر

نہیں بنوں گا۔"

ایک ہفتہ بعد ڈی سی طغیل احمد نے مجھے اپنی کوٹھی میں طلب کیا۔ چونکہ دور کی رشتہ داری تھی۔ اس لئے مجھے ایک پیالی چائے پلائی۔ جائے پینے کے دو ران انہوں نے پوچھا۔

"کیوں مدرساتم ہیڈ ماسٹر کیوں نہیں بننا چاہتے ہے؟" طلب مجھے ان کے انداز تھا طب سے دکھ پہنچا۔ وہ بجھے تم کہہ کر منا کر رہے تھے۔ بے شک وہ ایک اعلیٰ افسر تھے۔ لیکن میں ایک اصل انسان ہوں۔ میں اپنے منہ میاں سٹھونہیں بننا چاہتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو آئندہ نسل کو تعلیم دیتا ہے۔ بچوں کو صصح طور پر ان بنانے کے اصولوں پر عمل کرتا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ اعلیٰ اور افضل کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے دولت کی ہو سس نہیں ہے۔ میں اپنی آمدی بڑھانے کی خرچ نہیں کرتا۔ کسی عالیشان کوٹھی میں نہیں رہنا چاہتا۔ دل جائے صہبہ شکر سے گزارہ کر لیتا ہوں۔ لیکن ایک چیز ضرور چاہتا ہوں اور ذہ ہے عزت۔ میں چاہتا ہوں کہ سارے لوگ یہی خرت کریں۔ میرا نام کریں کہ میں پسچھے ایک ذمہ دار علم ہوں۔ میں ساری دنیا کے بچوں کو سمجھاتا ہوں کہ علم کی سند حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بگرشن چند رکا گدھا بھی والٹس چالن لے رہا سکتا ہے۔ اصل مقصد علم کو سمجھ کر حاصل کرنا ہے۔

جبکہ میں اتنی اچھی باتیں سمجھاتا ہوں تو اس تعلیم کے عنوان

قابلِ عزت ہونے کا حق دار کہلا سکتا ہوں۔ کوئی مجھے تخت پر نہ بٹھاتے۔ اپنے سامنے تختے پر ہی بٹھاتے۔ لیکن آپ کہہ کر تو مخاطب کرے۔ انہوں نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ کیا تم اونچائشنتے ہو؟ ابھی میں نے تم سے کچھ بچھا ہے؟ میں نے چاہتے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جناب! میرا مقصود بچوں کو پڑھانا ہے۔ اگر میں ہمیڈ ماسٹر بن گیا تو اسکوں کے دفتری کاموں میں الجھ کر رہ جاؤں گا۔ میرا تعلق صرف اسکوں ماسٹروں سے رہے گا۔ کبھی کوئی ماسٹر غیر حاضر ہو تو اس کی وجہ کلاس لینے کا موقع ملنے گا۔ جبکہ میں اسکوں کے تمام وقت بچوں کو پڑھاتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔ اس طرح جو مجھے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ ذہ ہمیڈ ماسٹر بن جانے سے حاصل نہیں ہوگی۔“

”تم انتہائی احمق انسان ہو۔ لوگ میری خوشامدیں کرتے ہیں۔“

”لند تم...“

ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں ایک جھنکے سے آٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی توہین سے لرزتے ہوئے کہا۔

”آ۔ آپ۔ کیا آپ اپنے سامنے کسی کو انسان نہیں سمجھتے؟“

بے شک آپ بہت بڑے افسر ہیں۔ لیکن میں بھی اسکوں ماسٹر ہوں آپ مجھے آپ نہ کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتے، کوئی بات نہیں۔ مگر میرے لئے احمد جیسے الفاظ تو استعمال نہ کریں۔ اگر میں احمد ہوں تو

آپ ہی بنا یہیں کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو کیا بنارہا ہوں۔؟”  
انہوں نے غصہ سے چین کر ملازم کو آدازدی۔ ملازم دوڑتا ہوا  
آیا تو انہوں نے کہا۔

”اس ماسٹر کو دھکے دے کر بہار سے باہر کرو۔“  
یہ کہہ کر وہ غصہ میں پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ لے چارے  
ملازم نے مجھے ہاتھوں نہیں لگایا لیکن ان کا اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ مجھے  
دھکے دیکر سکا لا جائے۔ میں بو جعلِ تدوں سے چلتا ہوا اس عالیشان  
کوٹھی سے باہر آگیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میں کس  
طرح اندر ہی اندر تو ہیں کے احساس سے درجاء برہا تھا۔ میں بڑے سے  
بڑا عدد مہ سہہ سکتا ہوں۔ مگر اپنی بے خزانی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس وقت اپنی حالتِ زار پر فہقہے لگانے کو جو چاہتا تھا۔  
مگر میں اس جنوں خواہش کو بڑی تکلی سے دبارہ رہا۔ کیونکہ حصہ تباہ  
سے لوث کے قبیلے لگانے والے پاگل کہلاتے ہیں۔

میں گھر میں پہنچا تو ناہید میرا انتہا کر رہی تھی۔ اس نے  
مجھے دیکھتے ہی فانچانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”جو لوگ اپنی بیوی کی بات نہیں مانتے، بزرگوں کے مشورے  
پر عمل نہیں کرتے۔ انہیں کم از کم اپنے عالم کے سامنے جھکنا  
پڑتا ہے۔ اب بتائیے۔ آخر آپ کو میرے بھائی جان کا حکم مانا  
پڑا۔؟“

بیں غصہ سے بے قابو ہو رہا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ناہیں کو قتل کر دیتا۔ بچوں کی معصوم دنیا میں رہنے والا استاد خون خراپے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ غصہ کی حالت میں بچوں سے یہی ہو سکا کہ اپنی عادت کے مطابق ناہیں کے کان پکڑ لئے۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنے کان چھڑاتی ہوتی بولی۔

”میں کوئی اسکول کی بھی نہیں ہوں کہ آپ کان پکڑ کر سزا دیں گے۔ آپ ہیری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔؟“  
یہ نے ناگواری سے جواب دیا۔

”میں نہ تمہارے سچائی جان کی پیش کش کو خکرا دیا ہے۔“

نہیں کا چہرہ درجua آگیا۔ تب میں بے احتیاط ہیچکے لگانے لگا۔ پہنچنے تو اپنی ہنسی خود ہیری سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر تپہ چلا کر میں انتقاماً ہیچکے لگانے لگا۔ کیونکہ میں نے صید ماسٹر نہ بن کر صرف ناہیں کوئی نہیں اس کے دی سی بھائی جان کو بھی احمدوں کے میدان میں شکست دی تھی۔ انہوں نے مجھے گھر سے نکال کر ہیری بے عزتی کی تھی۔ جو اپا یہ ان کی بے عزتی تھی کہ جسے دہ مہولی اسکول ماسٹر سمجھ رہے تھے، اس نے ان کی پیش کش کو خکرا دیا تھا۔

میرا جواب سن کر اس نے غصہ سے مٹھیاں بھینچ لیں، دانت پیسیتے ہوئے بچھے دیکھا۔ پھر اس نکھا ہوا ایک گلدان انٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کے بعد جنپ کر دیا۔

”میں ابھی اور اسی وقت اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ میرا آپ کے ساتھ  
گزارانہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہو سکتا.....“

یہ کہہ کر وہ طنطنا تی ہوئی اپنا سامان سمجھنے چلی گئی۔ میں جانتا تھا  
کہ ایسا ایک دن ضرور ہو گا۔ دائی میرے ساتھ اس کا گزارانہیں ہو سکتا تھا  
اب وہ میکے جا کر بیٹھنے والی تھی۔ میں نے اسے نہیں لدا کا۔ بعد میں میں نے  
سوچا کہ اسے سمجھا منا کر رد کیا چاہئے تھا۔

میں ایک ہفتہ تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ والپر نہیں آئی۔  
 محلے پڑوس کے لوگ میری گھر دالی کو پوچھنے لگے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے  
کے لئے اپنے پرانے سب ہی کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے ہیں۔ درمی  
عڑت نہیں رہتی۔ میں نے بات بنائی کہ میرے شر علیل ہیں، اس لئے  
بیوی کو وہاں چھوڑ دیا ہے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ کہا تھا۔ میرا فرمی ملامت کرنے لگا۔  
جب استاد جھوٹا ہو تو شاگردوں کو ستھان علم نہیں دے سکتا۔ میں ختم میر کی  
مارکھا کرنا پیدا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بستر پر پڑی ہوتی تھی۔ ایک ہی ہفتہ میں  
بیلی پڑ گئی تھی۔ میری ساس بہ خوشخبری سننا کر چلی گئیں کہ میں باپ بننے والا  
ہوں۔!

اچانک ہی میرا دل خوشیوں سے بھر گیا۔ میں نے چشم تھہmor میں دیکھا  
بچہ میری گود میں کھیل رہا ہے۔ پھر میں اسے سامنے بٹھا کر پڑھا رہا ہوں۔  
اسے اعلیٰ تعلیم دلدار ہوں۔ اسے انسان بنارہا ہوں۔!

ناہید کی آزاد نے مجھے جو زکا دیا۔

”بیٹھ جائیں۔ اب تو ہمارے اختلاف منٹ جانے چاہئیں۔“  
میں اس کے فریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر محبت سے اس کا ٹھہڑا  
کرنے والا۔

”اختلافات تم ہی ختم کر سکتی ہو۔ کیا اپنا بھائی تھم نہیں چاہوں گی کہ  
ہمارا بیٹھا ایسا ندار اور با اصول انسان کہلاتے ہے؟“

”ضرر ہاؤں گی۔ مگر یہ برداشت نہیں کروں گی کہ میرا بچہ پیدل  
اسکول جانے اور کار میں بیٹھنے والے بچوں کو دیکھ کر احساس مکتری میں ٹنبلہ  
رہے۔ اگر اپ را بھی سے آمدی نہیں بڑھائیں گے تو میں اپنے بچے پر آپ  
کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔“

”دیکھو تم پھر جنگرا بڑھانے والی باتیں کر رہی ہو۔ کیا مجھے اپنے  
بچے کے مستقبل کی فکر نہیں ہے؟ میں اسے اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔  
ایک سچا انسان بناؤں گا۔“

”جیسے کہ آپ ہیں۔“ ”دھچک کر لو۔“ میں آپ کے ساتھ  
نہیں جاؤں گی۔“

میرا دل ڈوپنے لگا۔ اب ناہید کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ ابادہ  
صرف ضدی شرپک بیات ہی نہیں بلکہ میرے ہونے والے بچے کی ماں بھی  
تحی سا در اس بچے کو میری کمزوری بنائے کر جو سے اپنی ضد منوا سکتی تھی۔  
ہمارے درمیان پھر تو تو۔ میں میں شروع ہو گئی۔ میرے سامنے سر،

سالے سالیاں سبھی جمع ہو گئے۔ اور مجھے الزام دینے لگے۔ طعنے بھی دیے کہ جب مجھے درولیٹشاونڈ زندگی گزارنی تھی تو میں نے شادی کر کے ناہید کی زندگی کیوں برپا کی؟

میں انھیں سمجھا نہیں سکتا تھا۔ اور ان کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں۔ اس لئے ناہید کے بغیر ہی گھر والپس آگیا۔ اصول اپنی جگہ اٹل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جذبات پریشان کرتے ہیں۔ پہنچنے ناہید کے لئے پیار کا جذبہ تھا۔ اب ایک بچہ کی محبت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے چند روز بڑی بے چینی میں گزرے۔ پھر میں بچوں کو پڑھانے میں نیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگا۔ تمام بچوں کے چہروں پر اپنے آنے والے بچے کی صورت دیکھ کر بہلنے لگا۔

اسی طرح دفت گزرنے لگا۔ نوماہ بعد خوشخبری ملی کہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں پھر ناہید کے درد از سے پر ہپنگ گیا۔ میری ساس نے بچے کو میری گود میں لا کر لکھا۔ وہ ناہید کی طرح خوبصورت تھا مگر اس کے تیوار میری طرح تھے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

وہ میرے جسم کا ایک حصہ تھا۔ میرا نام لیواتھا۔ میرے اصولوں کو آگے بڑھنے والا تھا۔ لیکن اس دفت میں نے دانتہ اصولوں کی بات نہیں چھیڑی۔ اس خوشی کے موقع پر میں دوبارہ جنگ چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر میں اسی طرح آنے جانے لگا۔ سوا ہیئے کے بعد میری

سas نے کہا۔

"تم نے بیٹی کو بہت عرصہ اپنے پاس رکھ لیا۔ اب تم اپنے گھر لے جاؤ۔"

"میں بھی بہت عرصے سے یہی چاہتا ہوں۔ مگر آپ کی بیٹی راضی نہیں ہوتی۔"

ناہید نے کہا۔

"آپ میری بات مان لیں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"جو پانیں میری دالنت میں غلط ہیں میں انھیں نہیں مان سکتا۔"  
میرے صدر نے فیصلہ سنایا۔

"تو پھر تمہیں اپنی بیوی اور بچے کے اخراجات یہاں پورے کرنے ہوں گے۔ ہر ماہ ساری ہے تین سور و پے نان نفقة کے لئے ادا کرنے پڑیں گے۔"

یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ ان دنوں آج جیسی ہنسکائی نہیں تھی۔  
شکواہ کمر لمتح تھی۔ اس وقت مجھے چار سور و پے ماہوار ملتے تھے مکان کے کرانے اور محلی پانی کے بل میں شرود پے چلے جاتے تھے۔ باقی تین سو روپے میں میرے اور ناہید کے کھانے کپڑے اور ناگہانی ضروریات میں خرچ ہو جاتے تھے۔ میں نے صدر صاحب کو حساب تباٹے ہوئے کہا۔

"اگر میں نان نفقة کے ساری ہے تین سور ادا کروں گا تو پھر میں کہاں

رہوں گا۔ اور کیا کھاؤں گا۔؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"ایکسٹر آدمی پیدا کرو۔ اگر نہیں کر سکتے تو چوری کرو۔ شادی کی ہے اور بچے کے باپ بنے ہو تو جس طرح بھی ہو سکے اپنی ذمہ داریاں پوری کر دے۔ اگر نہیں کرو گے تو یہاں پھرنا آنا۔ ہم تمہیں بچے کی صورت بھی دیکھنے نہیں دیں گے۔"

میں پریشان حال وہاں سے چلا آیا۔ میری تجھے میں نہیں آ رہا۔  
تھا کہ لوگ اتنی بڑی دنیا میں کسی ایک انسان کو یعنی ایمان دار رہنے کا موقع کیوں نہیں دیتے۔ اگر ناہبید بچے کو لیکر میرے ساتھ رہتی تو چار سو روپے ماہوار میں ہم آسانی سے گزارا کر سکتے تھے۔ لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اپنے بچے کو سینے سے لگا کر رکھنے کے لئے ناداً اور غریب بچوں سے فیس کے نام پر ایکسٹر آدمی پیدا کرنی لازمی تھی۔  
اگر میں پڑتے بچوں کا استحصال کرنا تو پھر بے ایمانی کے راستے کھلتے چلے جائے تعلیم کا مقصد غوتا ہو جاتا۔ نااہل بچوں کو رشتہ لیکر امتیاز میں پاس کر دیا جاتا۔ ہمارے ملک کے کتنے ہی مسلم ایسی ہی مجرمانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میرا ضمیر کسی جرم کے معاملہ میں میرا یا اُنہوں نہیں بنتا۔

میں یہ آخری فیصلہ سنانے کے لئے ناہبید کے دروازے پر گیا۔ کہ میں اپنے ایک بچے کی خاطر دنیا کے تمام بچوں کو نقصان

نہیں پہنچا سکتا۔ دہان جا کر تپہ چلا کر ناہید بچہ کو بیکر مجھ سے بہت دُور جید را باد اپنے بھائی کے ہاں چلی گئی ہے۔ جب تک میں اس کی شرافت تسلیم نہیں کر دیں گا۔ دد دا پس آگرا پنا اور اپنے بچے کامنہ نہیں دکھاتے گی۔!

پانچ برس گزر گئے۔ میں نے صبر کرنا سیکھ لیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۵۹ء کو اقوام متحده کی جنرل اسمبلی نے اتفاقِ راستے سے بچوں کے حقوق کا عالمی منشور منتظر کیا تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سارے عالم کے بچے میرے پاس تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ایک میرا اپنا ہی بچہ میرے پاس آگر نہیں پڑھتا تھا۔ اب وہ پانچ برس کا ہو گیا تھا۔ ناہید بچے کو بیکر کر اچھی دا پس آگئی تھی۔ میں اس سے ملنے کیا تو بچے کو چھپا دیا گیا۔ اب دن کے مرطابہ میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ میرے سُسرے نے کہا۔

”تم نے پانچ برس انک بیوی بچے کے اخراجات پورے نہیں کئے۔ ہم بچے کو تمہارے حوالے کردیں گے۔ کیونکہ قانون ناوجہہ تمہارا ہے۔ لیکن ہمارا قانونی مطالبہ ہے کہ بچے کو لیجانے سے پہلے ناہید کا دین ہے اور پانچ برس کے اخراجات پورے کرو۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”آپ لوگ میری شرافت سے ناجائز فائزہ اٹھا کر مجھ پر ملزم کر رہے ہیں۔“

”تم نے میری بیٹی پر ظلم کیا ہے۔ تم نے پانچ برس تک اس کی خبر نہیں لی کہ وہ کیا کھاتی ہیتی ہے اور کس عال میں رہتی ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ ورنہ اب تک تالوں چارہ جوئی کرتے تو تمہارے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔“

میں نے کہا۔

”میں بھی یہی کر سکتا تھا لیکن گھر کی عزت کو عدالت تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔“

”ارے تو اب لے چلو نا عدالت میں۔ پانچ برس میں پچاس روپے کی ترقی پائے دلے ماستر میں کتنا دم خم ہے، یہ ہم اچھی طرح چانتے ہیں۔ بخوردار خود کیزی پکر بھی مقدمہ کے اخراجات پورے نہیں کر سکو گے۔“

میرے شش حصہ صاحب درست فرمادی ہے تھے۔ مجھے جیسا غریب اسکوں ماستر مقدمہ بازی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بیوی کا پانچ برس کا نام نفقہ مجھ پر قرض کی طرح تھا۔ وہ قرض میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ہر کی رقم نہیں دے سکتا تھا۔ میں ایک ماستر تعییم کے سوا اکسی کو کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

لوبس اور گزر گئے۔ ناہید سے اور اپنے بیٹے سے چیزیں تھیں کے لئے رشتہ ٹوٹ گیا۔ ناہید نے طلاق نہیں لی۔ شاید اس لئے کہ طلاق کے بعد بیٹا میرے پاس آ جاتا۔ میں اس لئے طلاق نہ دے سکا

کہ ایمان داری سے ساری عمر ہر کی رقم جمع نہیں کر سکتا تھا۔

میرے سب ہی جان پہچان دالے میرے لئے یوں عالات سے  
دافت ہو گئے تھے۔ وہ بظاہر میری ایمان داری اور اصول پرستی کی تعریفیں  
کرتے تھے۔ مگر دھکے چھپے الفاظ میں مجھے الزام دیتے تھے۔ مثلاً ایک  
اسکول ماسٹر نے پہلے میری بہت تعریفیں کیں۔ پھر کہا۔

”نظام صاحب با آپ کی جتنی بھی تعریف کی جانے کم ہے مگر  
یہ دنیا والے آپ کی قدر نہیں کرتے۔ میں نے کسی سے سنا ہے۔ مجھے  
یاد نہیں آ رہا ہے کہ کس سے سنا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ ماسٹر اپنے دل کی بات کسی دوسرے کے حوالے  
سے بول رہا ہے۔ وہ بولنے لگا۔

”بہر حال ایسا تو کتنا ہی لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنی بیوی اور  
بچے پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ کی شریک حیات اگر کوئی غلط عورت  
ہوتی تو اب تک طلاق لے کر دوسری شادی کر لیتی۔ لیکن اس دنادا  
عورت نے اپنی جوانی کے چودہ سال آپ کی جدائی میں گزار دیئے۔“

”جدائی میں نہیں، صدمیں گزار دیئے۔“

”آپ جو کچھ بھی کہیں لیکن لوگ آپ کی بیوی کی حمایت میں بولتے  
ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ بچوں کی دنیا میں رہ کر بچے بن گئے ہیں۔ ایک  
عورت کی آرزوؤں اور امنگوں کو نہیں سمجھتے۔ آپ سینہا اس نتے نہیں  
دیکھ سکتے کہ بچوں نے آپ کو دیکھ لیا تو یہی سمجھیں گے کہ فلمیں

دیکھنا اچھی بات ہے۔ آپ وہاں تفریح کے لئے نہیں جاتے۔ آپ کے ساتھ آپ کی شریک حیات بھی گھر کی چار دیواری میں محدود ہو کر وہ گئی تھی۔ اس نظلوم عورت کی تفریح کے لئے گھر میں کم از کم ایک ٹی وی تو ہونا چاہیے تھا۔ بہت سے اسکول ماسٹروں کے ہاں ٹی وی، ریڈیو صورتے اور سنگار میر وغیرہ ہیں، آپ بھی یہ تمام سامان اپنے گھر میں لاسکتے ہیں۔ مگر کچھ لانے کی بجائے بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ دیکھتے ہیں نہیں کہتا۔ یہ دنیا کہتی ہے:-

ہاں دنیا اسی طرح کہتی ہے، جس طرح وہ کہہ رہا تھا۔ ان دلوں استوانات شروع ہونے والے تھے۔ میں مختلف جماعتوں کے لئے سوالات نیا کر رہا تھا۔ ہر سال کی طرح طلباء میر پیچے پڑ گئے کر میں سوالناموں کو پوشیدہ نہ رکھوں۔ انہیں کچھ بتا دیا کروں۔ دوسرے ماسٹروں نے سمجھایا کہ پہلوں کو پہلے سے سوال کے پرچے معلوم ہو جائیں تو دوسرے اسکو لوں کے مقابلہ میں ہمارے اسکوں کا زلٹ بہتر ہو گا۔ لیکن میری طرف سے دہی پرانا انسکار تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پچھے چند سوالات کے جوابات طو طے کی طرح رٹ کر پاس ہو جائیں۔ اور محض نمائشی تعلیم کی سند حاصل کریں۔

تقریباً اس برس اور گزر جانے کے بعد ایک دن یوں ہوا کہ میں ایک کلاس کے طلباء کی نجراں کر رہا تھا۔ لڑکے ریاضی کے سوالات حل کر رہے تھے۔ میں نے عدد بیچھے ہوئے ایک طالب علم

کو نقل کرتے دیکھ لیا۔ پھر اسے آواز دی۔

”جعفر! جو کاغذ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اُسے یہاں لے آؤ۔“

جعفر نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اچھا صحتمند انداز میں میرے برابر تھا۔ میں نے اسے بیلایا تو اس نے طنزیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ پھر اپنی جیب سے چاقوں کا لکڑا سے کھولا۔ اس کے بعد چینچ کے انداز میں چاقو کی نوک میز کی سطح میں پوسٹ کر دی۔ یعنی وہ چاقو ابک معلم کے سینے میں بھی پوسٹ ہو سکتا تھا۔

میرے دل کو ایک دھمکا سا لگا۔ یہ ہمارے تک کے بیچے ہیں۔ یہ ہماری تعلیم ہے۔ فحصہ زپھوں کا نہیں، ہمارے طرز تعلیم کا ہے۔ اگر ہم نام استاد درسی احمدوں پر عمل کریں۔ طلباء کے چار طانہ اقدامات سے مغلوب ہو کر بارشوت لیکر امتحانات کے سوالnamوں کو ظاہر نہ کریں تو بھوپوں کی نادان ضریبڑ رکھنے پڑھنے خیز کی نوک تک نہ پہنچے۔ میں نے جعفر کے قریب پہنچ کر کہا۔

”جب میں تعلیم دیتے آیا ہوں تو تمہیں یہ بھی سکھاؤں گا کہ سچائی کو قائم رکھنے کے لئے بھوپوں کو تیراڈ تلوار سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیتے۔“  
یہ کہتے ہی میرا نے چاقو کا دستہ پکڑ کر اسے اپنے قبضہ میں لیا پھر دوڑے پر ڈھونے ہوئے چپر اسی سے کہا کہ وہ پیدا ماسٹر کو بلا کر لے آئے۔

تھوڑی دیر بعد پیدا ماسٹر شریف نے آئے۔ انہوں نے

صورتِ عال کو سمجھنے کے بعد مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔  
”نظام صاحب! میری درخواست ہے کہ آپ حب弗 کو بہلی  
دارشگارے کر معااف کر دیں۔“  
میں نے کہا۔

”کاغذی صاحب! کسی بچے کی ابتدائی چوری کو نظر انداز کرنے  
کا مطلب ہو گا کہ ہم آئندہ اپنے معاشرے کے لئے اپنے باتوں سے  
ایک بڑے چور کو ابھی سے تیار کر رہے ہیں۔ بچوں کے ذہن میں یہ  
خوب سمجھانا چاہیے کہ جرم کے بعد سزا لازمی ہوتی ہے۔“

”نظام صاحب! آپ جیسے سچے اور با اصول انسان سے  
کوئی بحث میں جیت نہیں سکتا۔ ہم سب آپ کی قدر کرتے ہیں لیکن  
حب弗 محلے کے چیزیں میں نہ لڑکا ہے۔ اور چیزیں میں صاحب کے ہننوئی  
ذرارت تعليم کے شعبہ کے ایک بہت بڑے افسوس ہیں۔“

”ہونے دیجئے۔ ایک سچا حاکم اور افسوس میرے اس قدام  
کو سراہے گا۔ اور بے ایمان افسوں سے تو میں نے ڈرنا نہ ہی کہا  
ہے۔ پھر یہ کہ میں اس امتحان ہال کانگراں ہوں۔ مجرمانہ حکم کرنے  
والے بچوں کا معا سبہ کرنا میرا فرض ہے۔ آپ صرف ہمید ما۔ لیکی  
جیٹ سے حبفر کی کاپی پر یہ لکھ کر دستخط کر دیں کہ میرا اسام  
درست ہے۔“

ہمید ما سٹر کو میری خدے کے آگے دستخط کرنے پڑے۔ میں نے بھی

اس کا پی پرستخت گئے۔ پھر جعفر کو امتحان ہال سے نکال دیا۔ ایک بجے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ دو بجے میں اسکول سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ ایک تنگ سی گلی سے گزرنے کے دوران نوبی اور دسویں جماعت کے چھٹے طلباء نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان میں جعفر بھی تھا۔

میں نے کہا۔

”میرے بچو! میں پہلے بھی تمھاں چکا ہوں کہ سچائی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو سکتی ہے؛ تمہارے ہاتھوں اسپتال پہنچ سکتی ہے۔ مگر مر نہیں سکتی۔ میں اچھی باتیں سمجھاتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“

دد سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اچانک انہوں نے مجھ پر حمل کر دیا۔ ایک کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس ہاکی سے میرے سر پر ضرب لگائی گئی میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ مجھے سدنھلنے کا موقع نہ ملا۔ چاروں طرف سے لات اور گھوٹے پڑ رہے تھے۔ میں زین پر گر کر ہوش دھواں کھو بیٹھا۔

جب ہوش آیا تو میں اسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ میرے سر پر ادھ ایک ہاتھ پر پیاس بندھی ہوتی تھیں۔ شام کے وقت ایک پولیس انسپکٹر میرا بیان لینے آیا۔ اس نے میری خیریت پوچھنے کے بعد سوال کیا۔

"آپ پرنس نے حملہ کیا تھا؟ میرا خیال ہے وہ ایک سے زیادہ ہونگے۔"

"جی ہاں! ۔۔۔ وہ سب میرے اور آپ کے بچے تھے۔ تو میں اور دوسری جماعت کے طلباء تھے۔"

میں ان کے نام بنانے لگا۔ انسپکٹر نے تمام لڑکوں کے نام لکھنے کے بعد کہا۔

"میں اپنی ڈبٹی کے مطابق روپورٹ مذکور کروں گا۔ لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکال سکتا۔"

"انسپکٹر صاحب! ہم سب بچوں کا عالمی دن مناتے ہیں۔ ہمیں پہلے یہ سمجھنا پڑتا ہے کہ ہر دور کے بچے جوان ہونے ہیں تو وہ دوران کے مزاج کے مطابق بدلتا ہے اور بچوں کا ابتدائی مزاج والدین اور استادوں کے ذریعہ بتتا ہے۔ میں نے ان بچوں کی خاطرا اپنی بیوی اور بچے کو جھوٹ دیا۔ تمام ماسٹر ایسا نہیں کر سکتے۔ یہی نکہ اپنی آمدی پر قناعت کرنا بہت کم لوگوں کرتا تا ہے۔"

انسپکٹر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"صرف قناعت کی بات نہیں ہے، میں اپنی تعریف نہیں کرنا چاہتا۔ مگر سچ کہتا ہوں کہ میں رشوت یا حرام کے پیسے کسی سے نہیں لیتا۔ اس کے باوجود آپ کے اس کیس کو دیانت داری سے آگے نہیں پڑھا سکوں چکا۔ میری ملازمت خطرے میں پڑھلاتے تھی اگر آپ کو اسکول سے لکال دیا گیا تو آپ ٹیوشن پڑھا کر گزارا۔

کر لیں گے۔ لیکن میری ملازمت چھوٹنے کے بعد میں کہیں کانہ رہوں گا۔ بہر حال میں کوشش کر دیں گا کہ ان لذکوں کو تنبیہ کے طور پر تھیوڑی بہت سزا ضرور ملے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ چوداں بعد مجھے اسپتھال سے چھٹی مل گئی ساتویں دن اسکیل پہنچا تو وہ تمام لڑکے اپنے اپنے والدکے ساتھ آئے جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے ہبیدڑ ما سٹر اور اپنے بزرگوں کے سامنے کیا۔ پکڑ کر محمد سے معافی مانی۔

میرا نے کہا۔

"انہا ای اعمال با اذیات، اعمال کا دانہ ہماری ہیں پرستے۔ اگر تم سب نیک نہیں سے معافی مانگ رہے ہو اور تم نے اپنی غلط روشن کو چھوڑ دیا ہے تو میں صدق دل سے تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

تمام ما سٹر دی اور بزرگوں نے خوش ہو کر تالیاں بیجیں بھر جوڑ کے باپ نے کہا۔

"نظام عصاحب! ریاضی کی کاپیاں آپ کے پاس جائیں گی۔ ان میں میرے بیٹے کی کاپیاں نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے اسے امتحان سے نکال دیا تھا۔ اب جبکہ آپ اُسے صدق دل سے معاف کر چکے ہیں تو اسے صرف پاس مارک دے کر امتحان میں پاس کر دیں۔"

میں نے کہا۔

”چیز میں صاحب! میں آپ سب کے سامنے جعفر کو چند سوالات دتیا ہوں۔ اگر وہ انہیں حل کر کے پاس مارک حاصل کر لے تو یہ تعلیم دینے کا صحیح طریقہ ہو گا۔ آپ بھی فخر کریں گے کہ آپ کا بیٹا سفارش کے بغیر اپنی صلاحیتوں کے بل پر کامیاب ہوا ہے۔“

جعفر کا منہ لٹک گیا۔ اس کا چہرہ پیکھ کر چیز میں کی سمجھ میں آگاہ بیٹا سفارش کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ دونوں باپ بیٹے نے سہارے کے لئے دوسروں کو دیکھا۔ اسکوں کے ایک ماstry نے کہا۔

”نظام صاحب! آپ کبھی تو کسی کے لئے پچھے گنجائش رکھا کریں۔ جعفر امتحان سے پہلے بیمار تھا۔ اس لئے اچھی طرح تیاری . . . . .“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک کار اسکول کے احوالوں میں آگر کی۔ چہرے اسی دوڑتا ہوا آیا۔ پھر اس نے اطلاع دی رہ دی سی طفیل احمد صاحب تشریف لائے ہیں۔ تمام لوگ ان کے استقبال کے لئے ہال سے باہر رکھنے۔ طفیل احمد نے لوگوں کے ہجوم میں مجھے دیکھیں۔ پھر چیز میں سے دریافت کیا۔

”کیا نظام صاحب سے تصدیقیہ ہو چکا ہے۔؟“

چیز میں نے جواب دیا۔

”کسی عذتک ہو چکا ہے۔ ماstry صاحب نے جعفر کو عاف

کر دیا ہے۔ لیکن امتحان لئے بغیر اسے پاس کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ”

”اچھا۔ میں بات کرتا ہوں۔ !“ طغیل احمد مجھے اشارے سے بلا کر لوگوں سے درا در لے گئے۔ پھر آستنگ سے بولے۔

”تم سے بیوی چھوٹ گئی۔ بچہ چھوٹ گیا۔ اتنے برسوں کے بعد اب تو تمہیں عشق آجانی چاہیے۔ دیکھو میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا حسکم ہے کہ جعفر کو پاس کر دو۔“ جناب امیں جواب دے چکا ہوں۔

انہوں نے دانت پیتے ہونے بمحض دیکھا۔ پھر کہا۔

”ناہیں اور تم سے میرا درکار شدہ ہے۔ اس لئے میں یہ بتا رہا ہوں کہ میری آٹھ سالہ لڑکی فوزیہ سے جعفر کی نسبت طے ہو چکی ہے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میری بیٹی کی ہونے والی شش ماہی میں میری سہبکو ہو گی۔ !“

”جناب ایہ اسکوں ہے۔ آپ رشته داروں کا واسطہ کیوں دے رہے ہیں۔“

”بید قوٹ کے بچے۔ . . . .“ یہ کہتے ہی انہوں نے ایک زنددار طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ جیسے میرا منہ گھوم گیا دیسے ہی دنیا گھومنے لگی۔

کسی کا دماغ کب پھر جاتا ہے؟ جب اس کی خودداری اور

ایمانداری کے منہ پر طانچہ پڑتا ہے۔

میری آنکھوں کے سامنے اندر ہیرا چھاگیا۔ تب برس سے جو  
تعلیم دیتا آ رہا تھا۔ اس کی روشنی کی ایک رمق بھی نہ تھی۔ اُتنی جزو  
جہد کے بعد اندر ہیرا میرے حصہ میں آیا تھا۔

میں نے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے کبھی طمانچے مارے ہوں گے  
اس دنیا کے بڑے اپنی اناکے لئے ستھnam علوم کے منہ پر تھپٹ مارتے  
ہیں۔ میرا سرگرم رہا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچھا ہے کہ کچھ  
نظر نہ آتے۔ میں بلے حس النمازوں کے لئے اندرھا بن جاؤں۔ میں  
اس دنیا کے لئے مرجاون۔ تب میں نے پیغام کر کھا۔

”میں تمہاری دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں زندہ  
نہیں۔۔۔“

یہ کہتے ہی میں دھڑام سے فرش پر گر کر رگبا۔

میں نہیں جانتا کہ اس دن کے بعد میری زندگی کے دس برس ماٹی کی قبریں کیسے گزرے۔ بعض حالات میں کتاب پ زندگی کے اورات انگمہ ہو جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کچرا اگھر تک کیسے پہنچ گیا۔ سوچنے سے تمہیں آتا ہے کہ علم کے منہ پر طماںچہ کھاتے ہی تو ہین کا احساس اتنی شدت اختیار کر کیا تھا کہ میرا ذہنی توازن برقرار نہ رہا۔ شاید کچھ لوگوں نے مجھے دیوانگی سے فزانگی کی طرف دالپس لانے کی کوشش نہیں ہوگی۔ دماغی اسپتال میں علاج کرایا ہو گا۔ کچھ بے ضرر پا گل سمجھ کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا گیا ہو گا۔ انسان اگر ہوش و تواں کھو بیٹھے اور کسی کام کا نہ رہے تو وہ انسانی سماج کا کچرا بن جاتا ہے۔ اسی لئے میں بھی کچرا اگھر میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی کچرا چلنے والے بچے میرے پاس آتے تھے۔

میں مملکت کچرا آباد کا حاکم تھا۔ کھاؤ وہاں کا راشنگ آفیسر تھا۔ جو باری اندھبوئے کھانے جمع کرتا تھا۔ سکینہ اور دوسرے بچے، خالی ڈپے، بو تلیں، کپڑوں کے چیزیں، کاغذ اور سمجھو سی ملکر ٹے وغیرہ پختے تھے۔ سب کام کرنے تھے۔ میں کسی کو تعلیم نہیں دیتا تھا۔ کیونکہ تعلیم نے مجھے کچھ نہیں دیا انھا۔

اب میں علم کی بات کرتا ہوں تو چشم تصور میں کھردی طمانچہ میرے منہ پر پڑتا ہے۔ لہذا میں طمانچے کھانے والی سچائی کا سبق کسی کو نہیں پڑھاسکتا۔ لوگ کہیں گے کہ سچائی پر سے میرا ایمان اُٹھا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اُٹھا نہیں بلکہ ابیان اٹھا کر کچرا گھر میں اسی طرح چینیک دیا جاتا ہے۔

وہ گفتام معصوم بھی میری گود میں تھی۔ نوزاں تیدہ بچے بہت جلد اپنے ماخول سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی رہی دنوں میں اس کچرا گھر کی غلافت اور بُر بُو سے مانوس ہو گئی۔ میں اسے کوڑا کر کے ڈھیر میں جہاں ڈالتا تھا وہ وہی سو جاتی تھی۔

اس بھی کے ماں باپ کون تھے؟ پہلے میں سمجھا تھا کہ یہ بانو نکے شوہر اور شازبہ کا گناہ ہے۔ پھر دوسری رات کنیز نام کا ایک عورت اسے دودھ پلانے آئی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ یہ اس کی اپنی بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے بچے کے حصے کا دودھ پلانے آئی تھی جیرانی کی بات یہ تھی کہ خود اس کے شوہرنے اس مقصد کے لئے

اسے کچرا گھر میں بھیا تھا۔

اس رات کی صبح کنیز کا شوہر بیرے پاس آیا۔ پھر اُس نے رازداری سے پوچھا۔

”بھی کے ساتھ جو پانچ ہزار روپے تھے، وہ کہاں ہیں؟“  
میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ رقم تھا نیدار نسلی ہے۔ بھ۔  
تھا نیدار کی دھمکی یاد آئی۔ اگر میں یہ بات کہہ دیتا تو اس کچرا گھر سے بے دخل کر دیا جاتا۔ اب تو مجھے اتنی بڑی دلیل کے کچرا گھر میں رہنے کے لئے جھوٹ بولنا آگیا تھا۔ میں نے کہا۔

”اس بھی کے ساتھ پانچ ہزار روپے تو کیا پانچ پیسے بھی نہیں  
تھے۔ تم کون ہو؟ ایسی غلط باتیں کیوں کر رہے ہو؟“  
اس نے طنز پہ انداز میں کہا۔

”بڑے میاں جھوٹ نہ بولو۔ اس بھی کا نانا لکھتی ہے۔ میں اس گھر کا ڈرائیور ہوں۔ وہاں کے تمام راز جانتا ہوں۔ میں نے اپنے کاؤنٹ سے سنا ہے وہ بوڑھا لکھتی اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا کہ بھی کو اس علاقہ کے کچرا گھر میں اس نے چھوڑا ہے۔ کوئی نہ کوئی اسے اٹھا کر لے جائے گا۔ کیونکہ اس کی پاسکٹ میں پانچ ہزار روپے رکھ دیئے گئے تھے۔“

اتنا کہہ کر وہ ڈرائیور بیرے رو عمل کو جانپنے لگا۔ میں نے یوں لاپرواہی کا اظہار کیا کہ جیسے وہ بکواس کر رہا ہو۔ اس نے کہا۔

”جس رات بچی کو یہاں پھیکا گیا۔ اس کے دوسرے دن مجھے یہ بات معلوم ہوتی۔ میں یہاں آیا تو بہت سے لوگوں کی بھیر لگی ہوتی تھی پسکھ لوگ تہماری اور اس بچی کی تصویر میں کھینچ رہتے تھے۔ میں رات کو دوبارہ یہاں آنے کے خیال سے داپس چلا گیا۔“  
میں نے کہا۔

”اچھا تو پانچ ہزار روپے مجھ سے حاصل کرنے کے لئے تہماری بیوی نے اس بچی کو دودھ پلا یا تھا۔“  
”ہاں ! یہی سمجھو لو۔ نکالو پانچ ہزار...“  
میں نے سنبھل کر کہا۔

”آج تک دنیا کے کسی بچے نے اتنا ہنسنگا دودھ نہیں پیا ہو۔“  
بھائی اسے ایک وقت بھی دودھ پلانے کی کیا ضرورت نہیں۔ تم اس کے بغیر ہی مجھ سے اتنی بڑی رقم مانگنے آسکتے تھے۔“  
اس نے کہا۔

”میں اس بچی کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میرا ساتھ دو گے تو ہم دولت میں کھیلیں گے۔ اس بچی کو زندہ رکھ کر اس کے لکھپتی نانا کو بلیک میں کریں گے۔“

”اس کا نانا کون ہے؟“

”میں یہ راز نہیں بتاؤں گا۔ تم صرف میرے پار ٹزرو ہو گے۔ اس پانچ ہزار میں سے تمہیں پانچ سور و پے دوں گا۔“

”میرے پاس ایک پیغمبیر نہیں ہے۔“

”جھوٹ نہ بولو۔ میں تھیں ایک ہزار دوں گا۔“  
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے عقلمند بھائی! جب پورے پانچ ہزار میں ہضم کر سکتا ہوں تو پھر تمہارا پارٹنر بن کر انپے چار ہزار کا نقشان کیوں کروں؟“  
اس نے غصہ سے میراگریبان پکڑ کر کہا۔

”مکار بودھے! میں تیرا گلا دبادول گا۔ زندگی چاہتی ہے تو وہ رو پے نکال کر سامنے رکھ دے۔“

”میں زندگی نہیں چاہتا۔ زندگی کا مناق اڑانا چاہتا ہوں۔  
اسی لئے کچرا گھر میں بیٹھا ہوں۔ تم مجھے دھمکی نہ دو۔ البتہ میں تھیں دارنسگ دینا ہوں کہ تم نے میراگریبان نہ چھوڑا تو میں چیخنا شروع کر دوں گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ لگ جائے گی۔ پولیس والے آجائیں گے۔ پھر میں ان سے کہوں گا کہ تم بھی کے ماموں جان ہو...“  
وہ میراگریبان چھوڑ کر مجھے گھورنے لگا۔ پھر مجھے گھونسہ دکھاتے ہوئے بولا۔

”اب اگر تو نے مجھے بھی کا ماموں کہا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔  
میری بہن کی شادی اگلے ماہ ہونے والی ہے۔ وہ بے جیا، بلے غیرت نہیں ہے۔ تو اسے بدنام کرے گا تو...“

اس نے دنوں ہاتھا کر میرا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی۔

میں نے کہا۔

”نہیں ذرا سُختے سے دماغ سے سوچنا چاہئے۔ بھی کے سلسلہ میں سیری گواہی سب سے اہم اور قابل قبول ہوگی۔ کیونکہ بھی کوہیاں چھوڑ جانے والا میری نظر دن سے گزر آہوگا۔ اور میں نے اسے پہچان یا ہوگا۔ اگر تم کسی کی بہن یا بیٹی کو بلیک میل کرو گے تو میں یہی بیان دوں گا کہ تم اپنی بہن کا گناہ چھپانے کے لئے اسے میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔“

”دھٹکنا پڑ گیا۔ پر بیٹا ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔ اب دھ جابر اور سنگدل بلیک میل نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھ تھکے ہوتے انداز میں کچرے پر بیٹھ گیا۔ کھرپاڑے ہوئے جواری کی طرح بولنے لگا۔“ میں نے اپنی بہن کو باپ بن کر پالا ہے۔ اسے گود میں کھلایا ہے۔ اور اتنک اسے دلہن بناؤ کر خصت کرنے کے خواب دیکھنا آ رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔

”ہم اپنے بھائیوں اور بہنوں کو بھی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے بھوؤں کی طرح ان کا اچھا مستقبل بنانا چاہئے ہیں۔ بھوؤں کے اس عالمی سال میں ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم ان کے لئے کس انداز میں کیا کرنا چاہئے ہیں۔ اور نتیجہ کیا نکلتا ہے؟“

اس نے کہا۔

”میں اچھے انداز میں بہن کی ڈولی اٹھانا چاہتا تھا جب میری محدود آمدی سے خواب پورے نہ ہوتے تو میں مالک کی کار سے پڑی سے اور پیروں چرانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی میں پکڑا جاتا تو میری بہن چور کی بہن کھلاتی۔ لیکن ہم اپنے خوابوں کی تعبیرت ک پہنچنے کے لئے بُرے انعام کا خطرہ مول یتنے ہیں۔“  
”تو پھر خطرہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھو لو کہ تم کسی دوسرے کی بہن کو کانٹوں میں گھسیٹ کر انہی بہن کو بھلوں کا سہرا نہیں پہنا سکو گے۔“

”میں کسی کو بلیک میل نہیں کروں گا۔ تم مجھ پر ہر بانی کرو میری بہن کو انہی بہن سمجھ کر اس کے جہیز کے لئے پانچ ہزار روپے دو۔“  
میں نے کہا۔

”اگر بہن میری ہوتی تو میں اسے جہیز میں یہاں کا کچرا دیتا۔ یعنی انسان کو انہی ادفات کے مطابق لین دین رکھنا چاہیئے۔ اگر تمہاری ادفات کے مطابق تمہاری بہن کو کوئی بیاہنا نہیں چاہتا تو سمجھو لو کہ وہ بیچاری بھی دوسری بے چاریوں کی طرح اس سماج کا کچرا ہے۔ اسے یہاں بھیج دو۔ یہاں کم از کم زندگی خریدنے با قبول کرنے والے تو آہی جاتے ہیں۔“

وہ غصہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو پانچ ہزار کے لئے مجھے قتل کر دیتا۔ مجرہر شخص قتل کرنا نہیں جانتا۔

وہ پاؤں پختا ہوا دہاں سے چلا گیا۔ اس نے بھے بچی کے لکھپی نانا کا نام اور پتہ نہیں بتایا۔ میں اس سے اس نے نہ پوچھ سکا کہ یہ راز معلوم کرنے کے لئے اسے پانچ ہزار کی رشوت نہیں دے سکتا تھا۔

پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ بچی اپنے ماہول سے بہت زیادہ مالز ہو گئی تھی۔ اس سے دہاں کی غلطیات کا احساس نہیں تھا۔ بڑے لہر کے خڑے بھول گئی تھی۔ آرام سے کچھ میں پڑی اپنے ہاتھ پاؤں جھٹک کر کھبلتی رہتی تھی۔

ایک شام کی بات ہے۔ ایک نوجوان کچرا لہر کے سامنے آیا۔ وہ دُور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بچی میری گومیں کھبیل رہی تھی۔ وہ ہچکھاتے ہوئے قریب آ کر بولا۔

”بڑے میاں! کیا آپ میری عزت رکھیں گے؟“

اس نوجوان کا چہرہ دیکھ کر جانے کیوں اپنا پت کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس نے کہ اس کے چہرے پر بے شمار دکھوں کا سایہ تھا۔ میں نے کہا۔

”شاید تم یہ کہتے آئے ہو کہ یہ بچی تمہاری ہے۔ اور میں یہ بات کسی سے نہ کھوں۔؟“

”ہاں! مگر پہلے یہ لقین ہو جائے کہ یہ میری ہے۔ اس بچی کے ساتھ جو سامان تھا، وہ مجھے دکھائیں میں پہچان لوں گا۔“ میں نے سنتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو تم بھی پانچ ہزار روپے کے لئے آئے ہو۔ جاؤ بُرخودار اپنا کام کرو۔ یہاں سے تمہیں ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔"  
دہ خوش ہو گرلوا۔

"اوہ! تو یہ دبھی ہے تب کے باسکٹ میں پانچ ہزار تھے۔ مجھے ایک پیسہ بھی نہیں چاہتے۔ لیس مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میری ہے۔"  
یہ کہتے ہی اس نے بچی کو میری گود سے اٹھا کر چومنا شروع کر دیا  
پھر ذرا منہ بناؤ کر گولوا۔  
"کیسی بو آرہی ہے۔ کیا آپ اسے صاف ستر انہیں رکھ سکتے  
تھے۔"

میں نے کہا۔

"سال دو سال میں کچرا گھر کی عفافی ہوتی ہے تو میں بھی غسل کرتا ہوں۔ جب وہ وقت آتے گا تو میں بچی کو ضرر غسل کراؤں گا۔  
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بچی کو سینے سے لگا کر گولوا۔

"خدا یا! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ پھر میری بچی غلامت کے بھنپ میں کیوں پہنچ گئی۔"

"خدا سے کیوں پوچھتے ہو؟ اولاد کی ذمہ داری والدین پر ہوتی ہے۔ تم خود اپنے سوال کا جواب دو۔ اگر یہ گناہ نہیں ہے تو تم گناہ بخار نہیں ہو تو یہ کچرے میں کیسے بہنچ گئی۔؟ تمہاری بیوی، اس بچی کی ماں کہاں ہے۔؟"

”بaba! مجھ سے آپ کچھ نہ پوچھیں۔ میں نہیں بتاسکوں گا۔ اس کی ماں بہت معصوم اور منظوم ہے۔ میں اسے بذنام نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”کوئی دوسرا اسے بذنام کرے گا۔ تمہاری بیوی ایک لکھنپی باپ کی بیٹی ہے۔“

وہ لکھرا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پھر کہا۔

”اس کو شعبی کے ڈرائیور کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس بچی کے ساتھ یہاں پائی ٹھہر اور وہ پیدا آئے ہیں۔ وہ بچھ سے رقم وصول کرنے آیا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ اس بچی کے نانا کو بیک میل کر کے آئیں۔ وہ بھی رقمیں وصول کرتا رہے گا۔“

وہ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ بذنامی کس طرف سے بڑھتی آ رہی ہے۔

”بیٹے!“ میں نے زمی سے کہا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس ڈرائیور کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے تعاون کے بغیر ذہن کچھ نہیں کر سکے گا۔“

وہ مطمئن ہو کر مجھے احسان نمندی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بaba! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔“

”چکا سکتے ہو، صرف اتنا بتا دو کہ جب تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ یہ بھی جائز ہے تو کہر یہاں کیوں چھینکی گئی۔“

”وہ ہچکچانے لگا۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر دھجھے حقیقت نہیں بتائے تھا تو میں بھی کو اس سے جھینیں لوں گا۔ کبھی اس کی آگو دیں جانے ہوں دوں گا۔“ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے کہا۔

”جو کچھ مجھ پڑیں میری بیوی اور میری بھی پرستی رہی ہے۔ وہ میں بتا رہا ہوں۔ میرگی کا نام اور تپہ نہیں بتا ذلیل گا۔“

”صرف اپنا نام بتا دو۔ تاکہ میں نہیں مناطق کر سکوں۔“

”بیٹا۔ آپ مجھے بیٹا کہہ کر مناطق کریں۔ جب سے میں نے خون کے رشتہ کو سمجھنا شروع کیا ہے۔ شب سے میری یہ آرزو ہی کہ میرا کوئی باپ ہوتا اور مجھے بیٹا کہہ کر مناطق کرتا۔“

میرے دل میں نشتر پھینے لگے۔ یہ آرزو میری بھی رہی کہ میرا بیٹا کبھی سامنے آنا نہ میں اُسے بیٹا کہہ کر سینے سے اچکا لیتا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹے! تم باپ سے محروم ہو اور میں بیٹے سے...“  
”کیا دھر چکا ہے۔؟“

”نہیں، ایسا نہ کہو، میرا بیٹا زندہ ہو گا۔ ضرور کہیں اچھی زندگی گزار دہا ہو گا۔ کیا تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔؟“

”نہیں، آپ ایسا نہ کہیں۔“ بھی یقیناً زندہ ہوں گے۔  
پہلے میری امی غصے میں کہتی تھیں کہ مر گئے ہیں۔ جب میں پندرہ برس کا ہوا تو انہوں نے بتایا کہ میرے والد بہت ہی ضدی اور اصول پرست ہیں۔ اور ایک اسکول کے ماستر ہیں۔“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سانگا۔ میں نے تڑپ کر لوچھا۔  
”کیا تمہارے والد کا نام نظام الدین ہے؟“  
”آں؟“ اب وہ چونک کر میرا منہ تنخے لکھا۔ آ۔ آپ کیے جانتے ہیں؟ نہیں، میں اپنے والد کا نام نہیں بتاؤں گا۔  
”نام نہ بتانا اور بات ہے اور اپنے باپ کے نام کو تسلیم نہ کرنا اور بات ہے۔ جو اپنے باپ کے نام سے انکار کرتا ہے، خود کو اور اپنی محترم والدہ کو گالی دیتا ہے۔“  
وہ جھلاؤ کر بولا۔

”آپ کو ایسی بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟“  
”عقل کی باتیں سمجھانے کے لئے جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔“  
اس نے مجھے گھورتے ہوئے سمجھا۔

”میں اپنی بیوی کو ساتھ لے جاؤں گا۔“

”نہیں بیٹے! یہ قانون کے کھاتے میں اور اخبارات کے کاموں میں آچکی ہے۔ اسے زبردستی لیجانا چاہو گے تو میں شرمنپا ہوں گا۔“  
وہ فرم پڑ گیا۔

”میں آپ سے عزّت کی بھیک مانگ رہا ہوں۔“

”میں تم سے تمہارے باپ کا نام پوچھو رہا ہوں۔ لیکن نام بتانے سے پہلے اچھی طرح یقین کر لو کہ خود کو سکالی نہیں دے رہے ہو۔“  
”دہ مجبور ہو کر لولا۔“

”میرے والد کا نام نظام الدین ہے۔ اب سے دش برس پہلے میری ائمی نے جب مجھے بتایا کہ وہ اسکول ماسٹر ہیں تو میں ان سے ملنے کے لئے اس اسکول میں پہنچا۔ وہاں ہمید ماسٹرنے بتایا کہ وہ میڈیل اسپتال میں ہیں۔ میں اپنی ائمی کو یسکر دما غنی مر لیفروں کے اسپتال میں گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ میرے والد ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ چونکہ وہ بے ضرر پا گئی تھے کسی کو ان سے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے انہیں چنیل دارڈ میں رکھا گیا تھا۔ بچھلی رات وہ اپنے بستر سے اٹھ کر چلے گئے۔ اڑاٹک واپس نہیں آئے، پتہ نہیں کہاں بھٹکا رہے ہیں۔“

”وہ کہہ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو روانہ تھے۔ آنسو بھری آنکھوں کے سامنے میرے جھگر کا نکردا دھندا لارہا تھا۔ شام کی چھلیتی ہوئی تاریکی میں مجھے یوں لگا، جیسے وہ پھر گم ہو جائے گا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔“

”بیٹے! اس سے پہلے کہ میں مراجوں، میرے سینے سے گجاؤ، میں ناہمید کا شوہر اور تمہارا باپ ہوں۔!“

میری زبان سے اپنی ماں کا نام سنکر دہ چونک گیا۔ میں نے اُس کے نانا کا نام پتایا تو مقناطیسی رشتہوں نے اسے میرے سینے سے لاگر لگایا۔ میری خوشیوں کا اندازہ دہی کر سکتا ہے۔ جس کا بیٹا بچپن میں بچھرا ہوا درجوانی میں اچانک ہی آگر گلے سے لگ گیا ہوا، تھوڑی دیر تک میں اسے چوتارا ہا۔ وہ بچھے پیار کرنا رہا۔ میرے بدن سے پکرے کی بو اٹھ رہی تھی۔ مگر جذبات کے تھوم میں غلام طtron کا احساس ملت جاتا ہے۔

"آبا جاں! آپ نے یہ کیا حالت بنارکھی ہے؟"

میں نے کہا۔

"انسان کی امیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اور جب دہ خدا کی طرف سے ہونے والے فیصلوں کا انتظار نہیں کرتا ہے تو وہ اسی حال کو پہنچ جاتا ہے۔ اب سے چھ برس پہلے ہی بچھے رفتہ رفتہ اساس ہونے لگا تھا کہ میں پاگھل نہیں ہوں۔ یہاں کی ہر چیز کو ہر منفام کو ایک ہوشمند کی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں اس پچرا گھر میں بیٹھا رہا۔ اس لئے کہ میں اپنے اصولوں کو ہر قدم پر شکست کھاتے دیکھ کر تھک گیا تھا۔

بیٹھے! میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کسی کو تعییم نہیں دوں گا۔ اب اپنی اولاد کو دیکھ کر غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ جب تک بچوں کی محبت قائم رہے گی، تعییم کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ اگر مفاد

پرست لوگ بچوں کو غلط تعلیم کا زہر پلا رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ آخری سانس تک اس نہر کا توڑ کرتے رہیں اور اسکوں اور کابوں کو بچوں کا کچرا گھر بنانے کا موقعہ نہ دیں۔ تم میری طرح معلم بنو گے نا؟“ میرے بیٹے نے نرامت سے سر جھکا لیا۔

”جب میں اسکوں میں پڑھتا تھا۔ اور چھوٹی کلاس کے طلباء کو شوشن پڑھا کر اخراجات پورے کرنا چاہتا تھا تو اسی غصہ سے ہفتی نہیں — خبردار اسکوں ماسٹر کبھی نہ بننا — تم میرے بیٹے ہو۔ میرا بیٹا ڈپٹی کمشنر بنے گا — اس طرح یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی کہ مجھے معلم نہیں بننا چاہیے۔ اب تو میں ڈپٹی کمشنر بھی نہیں بن سکتا میں آپ جیسے قابل استاد کا بیٹا نہیں جماعت سے آگئے تعلیم حاصل نہ کر سکا۔“

میرے دل پر ایک نہر لگا۔ میں نے حمدرہ سے چور ہو کر کہا۔  
”بیٹے! نہیں آگے پڑھنا چاہیے تھا۔“

”کیسے پڑھتا۔؟ جب میں تو میں جماعت میں اول آیا تو اسی نے کہا — یہ باپ کی ذہانت لیکر کیا کرد گے؟ تعلیم سے کچھ حاصل نہیں ہوتا — تمہارے جیسے نوجوان لڑکے دیلڈنگ کا کام سیکھ کر ڈبی اور سعودی عرب جاتے ہیں۔ اور ہزاروں روپے کما کر لاتے ہیں۔ تم دیلڈنگ کا کام سیکھو۔ میں تمہارے ڈی۔ سی۔ ما موں سے کہہ کر نہیں سعودی عرب بجیع دوں گی۔!“

آہ! ناہیں نہ اردو روپے کی آمدنی کا خواب مجھ سے پورا نہ کر سکی۔ میرے بیٹے کے ہاتھوں اس کی تعبیر چاہتی رہی۔ دالدہ کی حرص اور آنندیں اولاد سے تعلیم کا حق چین لیتی ہیں۔ میرا بیٹا کہہ ہوا تھا۔

میں نے تعلیم چھوڑنے سے انکار کیا تو اُمیٰز ردنے لگیں۔ میرے دل نے کہا کہ آپ انھیں ساری عمر ملا تے رہے، مجھے نہیں ہلانا چاہئے۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ مگر میں پڑھتا اور کام سیکھتا رہا۔ جب دسویں جماعت کے امتحانات قریب آئے تو اُمیٰز نے میرے ہاتھوں میں پا سپورٹ لا کر رکھ دیا۔ سعودی عرب میں میری ملازمت کا بندوبست ہو گیا تھا۔ میں نے اُمیٰز سے التحابیں کیں کہ مجھے دسویں پاس کرنے کا موقعہ دیا۔ وہ میری التجا کو انکار نہیں کر پھر رونے لگیں۔ افسوس! بعض عورتیں بیوی کے روپ میں آنسو بہا کرنا کام ہو جاتی ہیں تو آنسو کا وہی حرہ اپنے بچوں پر آزماتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

”پھر کیا ہوا؟“

”پھر نوزیر آگئی۔“ اس نے اُمیٰز سے کہا کہ مجھے تعلیم مکمل کرنے دیں۔ اُمیٰز کو جب پہ چلا کر میں اور نوزیر ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو وہ خوشی سے کھل گئیں۔ وہ شروع ہی سے کسی بڑے گھر کی لڑکی کو بہو بنا کر لانا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے دوسرے کرے میں لے جا کر کہا۔

”ارے پگلے د تونے پہلے کیوں نہ بتایا کہ فوزیہ تجھے چاہتی ہے۔ اب تو میں تجھے ملک سے باہر نہیں جھوٹیں گی۔ فوزیہ کے پتا تجھے کسی محکمے میں افسر لگا دیں گے۔ تو دش جماعت پاس کر لے۔“

دوسرا ہے دن اُمی فوزیہ کے ہاں رشتہ مانگنے گئیں۔ وہاں ان کی بڑی بے عزتی ہوتی۔ فوزیہ کے پتا نے غصہ سے کہا۔  
 ”ناہیں۔ اپنی اوقات سے چڑھ کر بات نہ کرو۔ تم برسوں پہلے اپنے شوہر کے لئے آئی تھیں کہ میں اسے اسکوں کا ہیڈ ماسٹر بنادوں۔ تمہارے شوہر نے بعد میں میری جو بے عزتی کی ماں سے میں بھول نہیں سکتا۔ اس کے باوجود تجھے تمہاری اغربی پر ترس آپا تو میں نے تمہارے بیٹے کو سعودی عرب بھیجنے کا بندوبست کر دیا۔ یہ پچ ہے کہ چھوٹے لوگوں کو زیادہ منہ نہیں لگانا چاہئے۔ اب تم اتنی منہ چڑھ گئی ہو کہ اپنے چھوکرے کے لئے میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آگئی ہو۔ نکل جاؤ بیرے گھر سے۔ اور خبردار اسکی ادھر کا رخ نہ کرنا۔۔۔۔۔“

اُمی وہاں سے ردی ہوتی واپس آگئیں۔ ان کی زبانی تمام باتیں سنکر تجھے بہت غصہ آیا۔ ایک گھنٹہ بعد فوزیہ تجھے سے ملنے آئی۔ میں نے اسے خوب سنائیں۔ وہ ردی ہوتی بولی۔

”آپ مجھے غصہ کیوں دکھا رہے ہیں۔ اگر پتا پا کافی صد میرا نیصلہ ہوتا تو میں یہاں کبھی نہ آتی۔“

امی نے کہا۔

”فوزیہ! اگر تم میری بہو بننا چاہتی ہو تو ابھی فیصلہ کرو کہ میرے عمار سے شادی کر دیجی۔— کل جمعہ کا مبارک دن ہے۔ میں تم دعوں کا نکاح پڑھوا دوں گی۔— شادی کے بعد پھر تمہارے پیٹا مخالفت نہیں کر سکیں گے۔“

فوزیہ اتنا بڑا قدم اٹھانے ہونے ہچکپا رہی تھی۔— وہ مجھے دل و جان سے چاہتی تھی۔— انکا رسمی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اُنی نے اسے پیار دمحبت سے تجویز کیا تو وہ اپنے والدین سے لغادت پر آئا۔ ہو گئی۔— اُنی نے میرے نانا نانی اور اموں مانی وغیرہ کو اپنا راز دار بنایا کر دسرے دن گھر میں بلا یا اور سماں را نکاح پڑھوا دیا۔ اس رات فوزیہ دلہن بن کر ہمارے گھر میں رہی۔— دوسرا دن اُنی نے فون پر فوزیہ کے والدین کو بتا دیا کہ فوزیہ اب اُنکی بہو بن گئی ہے۔— یہ خبر سننے ہی اس کے والدین دور ڈلتے چلے آئے۔ پہلے تو انہوں نے بہت گرمی دکھائی۔— پھر بات نہ بخی تو نرمی سے کہا۔

”اچھی بات ہے۔— جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔— مگر فی الحال یہ بات چھپا کر رکھی جائے۔— ہم فوزیہ کو لے جاتے ہیں۔— تم اگئے جیسو عمار کی بارات لیکر آؤ۔— تاکہ چار لوگوں میں ہماری عزّت رہے اور ہم سب کے سامنے بیٹی کو دلہن بنائ کر خدمت کرسی۔“

امی ناضی نہیں تھیں۔ فوزیہ نے مجھ سے کہا۔

"عامر! میں نے آپ سے دفاکی۔ آپ کی بنگی۔ اب آپ  
میرے والدین کی تزیت رکھ لیں۔"

میں نے امی کو مجیور کیا تو انہوں نے فوزیہ کو اس کے والدین  
کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ میں خرافت میں مارا گیا۔  
انہوں نے فوزیہ کو کہیں غائب کر دیا۔ میں امی کے ساتھ وہاں گیا  
تو درانگ ردم میں فوزیہ کا باپ ایک پولیس انپکٹر کے ساتھ  
بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"انپکٹر! یہ وہی دنوں ماں بیٹے ہیں، اس عورت نے  
محض نہ کیا تھا کہ میری بیٹی اس کی قید میں ہے۔"  
امی نے کہا۔

"تیڈ نہیں کیا۔ تمہاری بیٹی کی مرضی سے میرے بیٹے کے  
ساقہ نکاح ہوا ہے۔"  
انپکٹر نے کہا۔

"اگر نکاح ہو چکا ہے تو یہ اچھی بات ہے، آپ مجھے فوزیہ  
سے ملا یئیں، میں اس کا بیان لوں گا۔"

"فوزیہ تو یہاں اپنے میکے میں ہے۔" میں نے کہا۔  
"لکھاں سست کرو۔" انپکٹر ناگواری سے بولا۔ "وہ یہاں  
نہیں ہے۔ تم لوگوں نے اُن سے کہیں لیجا اگر قید کر دیا ہے۔"

اس بات پر بحث شروع ہو گئی۔ ہم کہہ رہے ہیں تھے کہ فوزیہ اپنے والدین کے ساتھ میکے آئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے ایک شریف زادی کو اغوا کیا ہے۔ فوزیہ کے باپ طفیل احمد نے کہا۔

"تم ثبوت کے طور پر نکاح نامہ دکھاوے گے۔ تو اس نکاح میں شریک ہونے والے تمہارے تمام رشتے دار بھی حوالات میں پہنچا دیتے جائیں گے۔ جب تک میری بیٹی کو پیش نہ کر دے گے، تم لوگوں کے ساتھ مجرموں کا سا برتاؤ کیا جائے گا۔"

ہم ماں بیٹے ناکرده جرم کی مزرا پانے والے تھے۔ جو نکاح نامہ ہم پیش کرتے، وہ اس بات کا ثبوت ہو جاتا کہ میں نے فوزیہ سے زبردستی نکاح پڑھوا کر اسے کہیں قید کر دیا ہے۔ تاکہ وہ قانون کے دددازے تک نہ پہنچ سکے۔ ہماری بے گناہی صرف فوزیہ کی موجودگی سے ثابت ہو سکتی تھی۔ اور ہم نہیں جانتے تھے کہ اسے کہاں غائب کر دیا گیا ہے۔ طفیل احمد نے ہمیں اپنے بیڈ روم میں لیج کر احمد سے کہا۔

"ناہیں۔ اتنے میری عرatt کو مٹی میں ملانے کی جو کوشش کی ہے۔ اس کا تقاضہ توبہ ہے کہ میں تم دونوں کو حوالات پہنچا دوں لیکن اب بھی مصلحتاً سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم وہ نکاح نامہ مجھے دی دو اور عامر میری بیٹی سے دست بردار ہو جانے تو میں

ان پکڑ کو کچھ دے دلائے خصت کر دوں گا۔"

میں نے ان کے ندوں پر جھک کر کہا۔

"آپ میری اور فوزیہ کی زندگی برباد نہ کروں۔ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہے گی۔"

انہوں نے مجھے دھنکا دے کر فرش پر گرتے ہوئے کہا۔

"میرے سامنے لیلیِ حبنوں کی کہانی نہ سناؤ۔ فوزیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اب وہ تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ تمہاری ماں اچھی طرح جانتی ہیں کہ اس کی منگھتی سچپن ہی میں جعفر سے ہو چکی ہے۔ اگر زکار حنفیہ والپس مل جائے تو یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو گی کہ فوزیہ نے تم سے نکاح کرنے کی حقیقت کی تھی۔ اس کی شادی اگلے ماہ تک جعفر سے ہو جائے گی۔"

میرا دل گواہی دیتا تھا کہ فوزیہ مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی۔ مگر اسی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں ناکردار جرم کی سزا پاؤں۔ انہوں نے کہا۔

"عامر! میں نہیں جانتی تھی کہ فوزیہ نکاح کے بعد بدلتے ہیں۔ اب تم بھی اس رشتہ پر لعنت بھیجو۔ میں گھر جا کر زکار حنفیہ والے آتی ہوں۔"

میں نے اعتراض کیا۔ ایک ہار فوزیہ سے ملنے کی اتجایا کی مگر اسی اب میری سلامتی کے لئے طفیل احمد کا ساتھ دے رہی تھیں۔

میری ایک نہ چلی۔ مختصر یہ کہ امی نے وہ نکاح نامہ لاکر والپس کر دیا۔ میں نے فوزیہ کو طلاق نہیں دی۔ میرے طلاق دینے نہ دینے کی

کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ اب اس بات کا تحریری ثبوت نہیں  
نہ کہ فوزیہ کبھی میری شرپی حیات بنی تھی۔

میں لگھا کر فوزیہ کی جدائی کے غم میں بیمار پڑ گیا۔ وہ ایک رات  
کی دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ ایک رات میری ازندگی کا سرما یہ تھی میں  
اسے کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ مدرسے ہوتے ہوئے دل سے انتظار  
کرتا رہا۔ کہ ایک ماہ بعد وہ جعفر کی دلہن بن جائے گی۔ میں دورتی  
درستے اس کی کوئی تھی کے چھتر کا شناختھا۔ مگر اس کو تھی میں کوئی  
دو ہما بارات لیکر نہیں آیا۔ پہنچے چلا کہ شادی کی تاریخ آگے بڑھادی  
گئی ہے۔

میرے دل میں پھر امید کی کرن چکنے لگی۔ دل نے کہا کہ فوزیہ  
شادی سے انکار کر رہی ہے۔ اس لئے شادی کی تاریخ ٹھیک رہی ہے۔  
اسی طرح اور پانچ ماہ گزر گئے۔ نوزیر نے شادی نہیں کی۔ میری بے چینی  
بڑھ گئی۔ اس کی کوئی خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ مچھ سے برداشت  
نہ ہوا تو میں نے اس کی کوئی تھی میں فون کیا۔ دوسری طرف سے اس  
کی دالدہ کی آواز سناتی دی۔ میں نے کہا۔

”میں نوزیر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“  
اس کی ماں نے پوچھا۔

”تم کون ہو اور میری بیٹی سے کیا کہنا چاہتے ہو۔؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نے اتنے جعفر سے شادی

کیوں نہیں کی۔؟"

"ٹھٹھ آپ۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟"

"مئی! غصہ کرنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ آپ ایک عورت ہیں۔ ماں ہیں۔ آپ کی بیٹی پر جو ظلم ہو رہا ہے۔ آپ ماں کے نامے سے کیسے بدارشت کر رہی ہیں۔؟"

وہ چپ رہیں۔ شاید ٹھنڈے دل سے سوچ رہی تھیں۔ میں ایک ماں کی دکھتی رگ کو حیران نہیں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر مجھے ہلکی سی لک کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیسپور کو دیا تھا۔ دوسرے دن میں نے پھر فون کیا۔ اس بارہ ایک ملازم نے فون اٹھایا۔ میں نے کہا۔

"میں بیگم طفیل احمد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جواب ملا کہ وہ پھری رات شہر سے باہر گئی ہیں۔

اس کے بعد تین ماہ تک فوزیہ کی دالدھ سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ آج۔ ابھی، یہاں آنے سے پہلے میں نے اس کو تھی میں فون کیا۔ تو دوسری طرف سے آواز سنتے ہی میل دل دھڑکنے لگا۔ وہ فوزیہ کی آواز تھی۔ میں نے کہا۔

"فوزیہ! میں تمہارا عمار بول رہا ہوں۔ تم کہاں گئم ہو گئی تھیں۔؟"

"عامر!" اس کے اندازِ تناظر میں تراپ اندھے چینی تھی۔

دہ بولی۔ ” میں یہاں سے فرار ہو کر تمہارے پاس پہنچنے ہی دالی تھی۔ اچھا ہوا تم نے رابطہ قائم کر لیا۔ ہم لڑکا رہے ہیں عامرا میں تمہاری ایک بیٹی کی ماں بن چکی ہوں، مگر بیٹی بیرے پاس نہیں ہے۔ ”

میں نے کہا۔

” تم خوشخبری بھی سنارہی ہو۔ اور ماہوس بھی کر رہی ہو۔ تناقہ تماں بیٹی کہاں ہے؟ ”

” میں کیا بتاؤں۔ زچکی کے بعد میں بے ہوش ہو جتی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد مر گیا۔ میں نے ردھو کر صبر کر لیا۔ مگر آج ہپا کا ایک ڈرائیور میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔

” بی بی جی! اچھے ماہ میری بہن کی شادی ہے۔ اگر آپ مجھے پانچ ہزار روپے دیں گی تو میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں گا۔ ”

میں نے سمجھا کہ شاید وہ تمہارے بارے میں کچھ بتائے گا۔

میں نے اس کی مطلوبہ رقم دینے کا دعہ کر لیا۔ تو اس نے بتایا کہ میری گھر شدہ بچپن زندہ ہے اور طائق روڈ کے سمجھے ایک کچرا لگھتے اس میں ایک بوڑھے کے پاس ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے مہنگے کے پاس جا کر ان کا گریبان پکڑ لیا۔ پھر چیخ کر لو لی۔

” آپ کیسی ماں ہیں؟ کیا آپ مجھے کسی کچرا لگھر میں پھینک سکتی

ہیں۔ اگر نہیں تو بتائیے میری بیٹی کو کہاں پھینکا ہے۔ کیوں  
پھینکا ہے؟"

مئی نے رد تے ہوتے کہا۔

"بیٹی! میں نے یہ ظلم نہیں کیا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہارے  
پیارے بہت سے ہی محبوسے کہا تھا کہ میں کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس  
تمہیں لیجا کر بچے کو خدا تعالیٰ کر دوں۔ مگر تم نے چار ماہ تک یہ بھیہ  
چھپائے رکھا تھا۔ بچے کو خدا تعالیٰ کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ اس  
لئے انہوں نے صبر کیا۔ جب بچی پیدا ہوئی تو میں ان کے راستے  
کی دیوار بن گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ بے شک آپ اپنی عزت  
کی خاطر بچی کو نوزیر سے الگ کر دیں۔ مگر اسے ہلاک نہ کر دیں۔ انہوں  
نے میری بات مان لی۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے تمہارے ماموں کو  
ان کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بھی کوکاٹ  
میں رکھ کر کہیں لے گئے۔ والپی میں تمہارے ماموں نے بتایا۔ کہ  
اسے پانچ نہار و روپے کے ساتھ ایک سچرا گھر میں چھوڑ دیا گیا ہے۔  
نوزیر فون پر ساری داستان سنارہی تھی۔ پھر اس نے

آنسو بھرے ہوچے میسا کھا۔

"عمر! وہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ نوراً دہاں جا کر اسے  
حاصل کرو۔ نہیں تو میں درجاؤں گی۔"

میں نے اس سے وعدہ کیا۔ اس نے بھی وعدہ کیا کہ جب

میں فون پر اُسے بچی کے ملنے کی خوشخبری سناؤں گا تو آج رات  
وہ میرے گھر پلی آئے گی اور مجھے ساری داستان سنائے گی کہ  
کس طرح اسے شہر سے درملے چاکر تیر کیا گیا انہا۔ بہر حال میں  
اپنی بچی کو لینے یہاں آگیا۔ آج تقدیر ہر بان ہے میں سوچ  
بھی نہیں سکتا انہا کہ میری بیٹی اپنے دادا کی گود میں کھیل رہی ہو گی۔!  
یہ کہہ کر عامر خا موش ہو گیا۔ میں نے بیٹے کو مسکرا کر دیکھا  
پھر پوتی کو سینے سے لگا کر کہا۔

”بچوں کو نتام جائز حقوق ملنے چاہیں۔ تمہارا حق ہے کہ  
تمہیں باپ کی محبت اور توجہ ملے۔ میں تمہیں آگے پڑھائیں گا  
یہ بھی بھی اپنا حق چاہتی ہے کہ اسے تمہاری اور فوزیہ کی گود ملے۔  
تم بچی کو لیکر یہاں بیٹھو میں اپنی بیوکو کو یہاں لیکر آؤں گا۔“  
”ابا جان! اب اس کچرا گھر میں بیٹھنا کیا ضروری ہے؟ میں  
بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں بیٹے! ہر شخص کا محسوبہ ہونا چاہیے جس نے جو  
کچرا چینکاہے، وہ اپنا کچرا سمجھنے آئے گا۔ تم مجھے اپنی امتی۔ اور  
فوزیہ کا پتھر بتاؤ۔“

میں پتھر معلوم کرنے کے بعد کچرا گھر کے اندر گیا۔ وہاں سے  
اپنی جمع پوچھی اٹھائی۔ کل بائیس روپے ستر پیسے تھے۔ لندے  
بازار کا ایک سوٹ رکھا ہوا تھا۔ آنے والادن میرے لئے عید کا

دن ہو گا۔ اور آج کی رات ”شبِ برات“ تھی۔ اس لئے اب غسل کرنا اور کپڑے بدلتنا لازمی تھا۔

میں نے ایک حمام میں جا کر بال کٹوانے، شیو بنوا�ا۔ غسل کر کے بعد بیاس تبدیل کیا۔ میرا حلیہ ایک دم ہی بدمل گیا۔ آئینے میں خود دیکھ کر تیین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خندکی اور اصول پرست اسکوں ماسٹر دوبارہ نندہ ہو گیا ہے۔

ناہید کے دروازے پر ہنچ کر میں نے دستک دی۔ یہ دہ دروازہ تھا جہاں سے میں ہبیثہ خالی ہاتھ دالپس جاتا تھا۔ دروازہ کھلا تو ناہید یوں سہم گئی جیسے مردہ رات کے وقت نندہ ہو کر سامنے آ گیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

”مجھے پہچانتی ہو؟ پیس بس سہ ماہے درمیان اصول کی جنگ جاری ہے۔ آج میں اس کا نتیجہ سننے آیا ہو۔“  
دہ دنوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر دنے لگی۔ میں نے اندر آگر دروازے کو بند کیا تو وہ میری گردن میں پانہیں ڈال کر پڑی مدت کے بعد میری آغوش میں چھپ گئی۔

”میں ہار گئی۔ میں آپ کو پریشان کرنی رہی۔ شاید اس طرح میرے گھر میں اونچی کوائی کافر نہ چڑھے سنگاڑ میزادری فتح ہر بڑی جیسا سامان آ جائے گا۔ آپ بے ایمانی پر آمادہ نہ ہوئے تو میں نے عمار کے ذریعہ ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔“

میرے بیٹے کی تعلیم چھوٹ گئی۔ وہ دن رات پر لیثان رہتا ہے۔ اکثر انوں سو میں نے سنا ہے، وہ نیند بیٹ کر رہتے ہوئے فوزیہ کو پکارتا ہے۔ اس کی کراہیں سنکر میرا کچھ کہنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں؟"

"جب تم ہار چکی ہو تو اب کچھ نہ کر دے۔ میں کروں گا۔ میں پارنے کے بعد ایک باز پھر میدانِ عمل میں آگیا ہوں۔ عامر سے ملاقات ہو چکی ہے۔ اور ایک خوش خبری سنو۔ ہماری ایک بہت ہی خوب صورت سی پڑی ہوئی ہے۔"

ناہید نے چونک کر مجھے جیرانی سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"تمہیں بنانے کے لئے بہت سی باتیں ہیں۔ چلو ہم ہو کے پاس چلیں۔ میں راستے میں تمہیں سب کچھ تباہوں گا۔" وہ مجھ سے الگ ہو کر ایک حصہ درق کے پاس گئی۔ پھر اسے کھول کر میرا ایک پرانا لباس نکالا۔

"جب میں آپ کے گھر سے آخری بار نکل کر آئی تو اپنے ساتھ آپ کا یہ لباس لے آئی تھی۔ آپ کے لباس سے عجیب سی بوآرہی ہے۔ آپ اسے بدل لیں۔" میں نے کہا۔

"تعجب ہے! مجھ سے عنداشت رہی اور میرے لباس کو ٹرے چلن سے سنبھال کر رکھا ہے۔" وہ سر جھکا کر لوی۔

"عدالت آپ سے نہیں، آپ کے اصولوں سے تھی۔ اب ذہ بھی نہ رہی۔ جب عامر سوچاتا تھا۔ تب میں آپ کا لباس سینے سے الگاتی تھی۔ اسے چوتھی تھی۔ پچھتاتی تھی۔ پھر آپ کو آنسوؤں سے پکارتے پکارتے سوچاتی تھی۔"

خورت کیا ہے؟ زحمت بھی ہے اور محبت بھی۔ وہ اپنی خندہ اور انانیت کے ہاتھوں گھر کو جنم بناتی ہے۔ شوہر سے الگ ہو جاتی ہے مگر اس کے لباس کو یا اولاد کو سینے سے لگا کر رکھتی ہے۔ یہ بھی محبت کی ایک راستہ۔ لیکن بڑی مہنگی ادا ہے کہ

لباس تبدیل کرنے کے لئے۔ ناہید کے ساتھ طفیل احمد کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں میں نے اپنی پوتی کے ملنے کی سایی داستان سناتی۔ ناہید سن رہی تھی اور بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ کیسی برس تک کامٹوں میں زندگی گزارنے کے بعد ہپول جیسے نازک اور لہر جیسے مستحکم رشتے پھر آپ میں مل رہے ہیں۔

رات کے دلش بجھے ہم کو نہیں میں پہنچے۔ فوزیہ کی بھائی نے دردرازہ کھولا۔ طفیل احمد صوفی پر بیٹھے سگار کا کش لگا رہے تھے مجھے دیکھتے ہی سگار کا دھواں حلتوں میں چنس گیا۔ کھانی کا عود پڑ گیا۔ کھانتے کھانتے ان کے دیدے آنکھوں کے علقوں سے اس طرح ابھر گئے جیسے وہ دیر سے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہے ہوں

پہچان رہے ہوں - میں نے کہا۔

”ٹفیل صاحب! اچھی طرح پہچان لیجئے، میں وہی مقتول ہوں، جسے آپ نے ایک طماںچے سے قتل کر کے کرڈ اکر کر طکیہ قبرستان میں پہنچا دیا تھا۔ اب یہ مردہ زندہ ہو کر تمہارا حمایہ کرنے آیا ہے۔“  
”دہ کھانتے کھانتے بولے۔“

”چلنے جاؤ پہاں سے، بھاگ جاؤ...“

”خالی ہاتھ نہیں، ہم اپنی بھوکو بیکر جائیں گے۔  
فوزیہ کی بھی ندوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔ ٹفیل احمد نے غصہ سے کہا۔

”پہاں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ سپرھی طرح چلنے جاؤ، ورنہ ملازم دھکے دے کر نکال دیں گے۔“

”آپ نے پہلے بھی ایک بار اس کوٹھی سے دھکے دیتے تھے  
مگر آج تقدیر آپ کو دھکے دے رہی ہے۔ جو کچھ آپ نے  
بھیا، اسے کامنے کا وقت آگئا ہے۔ اگر آپ فوزیہ کو ہمارے  
حوالے نہیں کریں گے تو وہ بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ جمیون  
بھیں قانون کے ذریعہ فوزیہ کا طبق معاشرہ کرانا پڑے گا۔ نب  
یہ راز فاش ہو جائیگا کہ آپ کی بیٹی میری پوتی کی ماں بن چکی ہے۔“  
ٹفیل احمد کے چہرے کا رنگ ازگیا، ایک مردے کا  
چہرہ نظر آنے لگتا۔ دہ ہیکلاتے ہوئے بولے۔

”نت - تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کوئی بھی دچّی تھمارے پاس نہیں ہے۔!“

میں نے سہنستے ہوئے کہا۔

”آپ نے اپنے جرم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن تقدیر کے اس مذاق کو کیا کہا جاتے کہ ۲۳ دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب کو آپ کار میں بیٹھ کر پھر اگھر کے پاس آئے۔ آپ کا خیال تھا کہ آپ بھی کوئی پھر اگھر میں پھینک رہے ہیں۔ مگر قدرت یہ تماشہ دیکھ رہی تھی کہ ایک نانا اپنی نواسی کو اس کے دادا جان کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہے۔ میں دہاں موجود تھا۔ کیونکہ تھمارے اعمال نے مجھے اس پھر اگھر میں دلساں سال پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔“

”وہ مجھے گھورتے رہتے۔ میری باتوں کے وزن کو سمجھتے رہتے پھر انہوں نے ڈھنڈائی سے کہا۔

”میں سمجھتا تھا کہ اپنی بیٹی کو اپنی منہی میں رکھوں گا تو میری عزت رہ جائے گی۔ میں تم لوگوں کو بڑی سے بڑی رتم دینے کے لئے تیار ہوں۔ تھمارے بیٹے کو اچھی ملازمت کے لئے ملک سے باہر بھیج دوں گا۔ تم لوگ فوزیہ کا خیال چھوڑ دو۔ وہ جعفر سے شادی کے لئے راضی ہے۔ اسی لئے میں اُسے یہاں لاياں ہوں۔“  
ان کی بات ختم ہوتے ہی فوزیہ کی محیٰ دوڑتی ہوئی آئیں۔ پھر ایک تھہ کیا ہوا کاغذ اپنے شوہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”فوزیہ راضی کب تھی۔ آپ اُسے فریب دے رہے تھے بیٹی آپ کو فریب دیکر پہاں آگئی تاکہ یہ سارے فرا۔ ہونے کا موقعہ مل جائے۔ اسے پڑھیئے۔ وہ اپنی بھتی کے پاس پھر اگھر پڑھی ہے۔“

”پھر اگھر۔؟“ طفیل احمد نے بوکھلا کر کہا۔ اس کا غرض کی تحریر کو پڑھا۔ پھر بھاگتے ہوئے باہر گئے۔ ہم سب ان کے پیچے دوڑے۔ فوزیہ ان کی کار لے گئی تھی۔ انہوں نے ملازم سے چیخ کر کہا۔

”جاڑ بھاگو۔ جلدی سے ایک ڈیکسی لیکر آؤ۔“ ملازم بھاگتا چلا گیا۔ وہ اضطراب کی حالت میں کوٹھی کے اعلیٰ سے باہر آئے۔ ہم ان کے پیچے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے جعلہا کر کہا۔

”تم لوگ میرے پیچے کیوں آ رہے ہو۔ لہب اگر جباز پہاں سے....“

فوزیہ کی متی نے کہا۔

”آپ نے اب تک اپنی سی کوشش کر لی۔ لیکن ہونے والی بدنانی برس تو پچھا کر رہی ہے۔ بہتر ہے آپ اب گھر میں بیٹھیں۔ اپنی شسرائی پہنچ گئی ہے۔“

انہوں نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ میں نے کہا۔

”بچی کے سلسلے میں روپورٹ درج ہو چکی ہے۔ آپ زندہ رہیں یا مر جائیں۔ یہ مقدمہ عدالت تک پہنچے گا۔“

انٹے میں ٹیکسی آگئی۔ طفیل احمد سے پہلے ہی ہم لپک کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مجبوراً انہیں بھی بیٹھنا پڑا۔

راستے میں فوزیہ کی دمّتی نے کہا۔

”میں تسلیم کرتی ہوں کہ میری بیٹی آپ کی بہو ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم سب مل کر اس بدنامی سے بچ سکتے ہیں۔ ہم یہ بیان دیں سکے کہ بچی پیدا ہوئی تو کوئی بدمعاش اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اور کچھ راگھر میں یجا کر چینک دیا تھا۔ ایسی ہی بہت سی باتیں بنائی جاسکتی ہیں۔“

میں نے کہا۔

”سچانی کو بنلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بنتی چلی جاتی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے دیانت داری سے تعقیم دینے کے لئے اپنی بیوی اور اپنے بچے کو چھوڑ دیا۔ آپ کے شوہر کے احکامات کو ٹھکرا دیا تھا۔ زندگی کے دش برس کچرا گھر میں گزار دیئے۔ میں آج بھی وہی پتھر ہوں۔“

محترمہ بچوں کے عالمی سال میں بڑوں کا حیا سبھہ ہو گا کہ ہم اسکوں کے ساتھ اپنے عامرا دراپنی فوزیہ کے ساتھ اور

اپنی نواسی اور پوتی کے ساتھ کس طرح خود غرض ہو کر سلوک کرتے ہیں۔ نئی نسل کی سوئی میں جو زہر ہوتا ہے، ادھ ہماری غلط پر دش اور روشن کے چور دروازے سے اُن کے دماغوں میں پہنچتا ہے۔ ان معاملات میں نظام الدین اسکول ماسٹر سے مجموعہ ناممکن ہے۔"

ہماری ٹیکسی کچرا گھر کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں طفیل احمد کا کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم نے ٹیکسی سے باہر آ کر دیکھا۔ کچرا گھر میں ایک موسم بنتی روشن تھی۔ فوزیہ دیوار کی طرف منہ کئے میری پوتی کو دد دھ پلار ہی تھی۔ عامراں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ فوزیہ نے سر گھما کر دیکھا۔ پھر اونچی آواز سے بولی۔

"پیتا! اگر آپ جھوٹی عزت کا کفن لپیٹ کر آئے ہیں تو یہیں مر جائیے۔ آپ کو پیتا کہتے ہوئے میری زبان جلتی ہے۔ رسول اللہ کا حکم تھا کہ بیٹیوں کو زندہ دفن نہیں کیا جائے گا۔ آپ کیسے ملہان ہیں؟ آپ نے میری بیٹی کو کچھے کی قبر میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ آپ کے دماغ میں کیسا کچرا بھرا ہے۔؟"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر دنے لگی۔ ہماری آنکھوں، بھی بھیکنے لگیں۔ درد کے رشتہ محبت سے آنسو ہمارتے تھے۔ طفیل احمد ہو لے ہو لے بڑا رہا تھا۔

"بیٹی! رات ہے۔ ستانا ہے۔ دوسرے لوگ نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ میری اعزّت رکھ لو۔ داپس چلو بیٹی....."

ایسا کہتے وقت دہ بھی رورہا تھا۔ مگر آنسوؤں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس کے دماغ کے کبار خانہ سے آنسو کچرے کی طرح آنکھوں کے راستے پہنچ رہے تھے۔

ختم شد

**مُحقِّقُ الْمُتَهَبِّنِ نَوَاب**



پسندیدن سب اپنے

محمی الدین نوابی

لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں کالج کے احاطہ سے نکل رہی تھیں۔ ان میں سے بعض اپنی اپنی کارڈ میں بیٹھ رہی تھیں۔ اور مشتری ایسی تھیں، جو بس اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ پناپان شاپ کے سامنے کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے کہا۔

”پناہی! ایسا مالے دار پان لگانا کر ممل کے دو پئی کی طرح ہر شٹ لال ہو جائیں۔“

لبس اسٹاپ پر کھڑی ہوئی ایک لاکر نے لال دو پئے والی سے کہا۔

”کچھ سننا؟ تیرے لال دو پئے کو دیکھ کر بول رہا ہے۔“

سرخ دوپئے والی نے کہا۔

”اوہہ۔ سینڈل سے منہ لال کر دوں گی۔ پان کھانا بھول جائیں گا۔“

اسی بس اسٹاپ پر کچھ اسماڑ قسم کے نوجوان انہی کار اور  
موڑ سائیکلوں کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ ایک نوجوان نے ایک  
مولی بھاری بھر کم سی لڑکی کی جانب دیکھ کر اپنے ساتھی سے پوچھا۔

”یا را نسلم اسٹار سلیم موٹاکی تانیش کیا ہے؟“  
دوسرے نے جواب دیا۔

”سلمی مولی!“

ایک لڑکی آہستگی سے بولی۔

”اے سلمو! اب یہ تھے کہہ رہے ہیں۔“

سلمی مولی نے ذرا شراکر کر کھا۔

”میری صحت الی ہے کہ سب ہی جلتے ہیں پر دانوں کی طرح۔۔۔“

”ہاتھی!“ ساری لڑکیاں اسے جیرانی سے دیکھنے لگیں۔

ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔

”بابرا! دیکھ وہ تیرا اسکو ٹردالا آگیا۔“

ایک نوجوان تیزی سے اسکو ٹردرا یتوکرنا ہوا آیا۔ پھر لڑکیوں  
کے قریب زوردار بڑیک لگا کر کر گیا۔ پابرانے اسے غصہ سے دیکھا۔

پھر منہ پھیر لیا۔ نوجوان نے بینے پر ہاتھ رکھ کر کھا۔

”ہاں من! آپ کے لئے آندھی طوفان کی طرح ٹریفک ہی جیز  
سے گزر کر آیا ہوں۔ تشریف لا یں۔ آپ کے لئے میری گاڑی کیا اے۔  
میرے دا، کام! ایک سیٹ ہمیشہ غالی رہتی ہے۔“

باہر آنے بھڑا کر دہا۔

"اگر آپ اپنی خیریت چاہتے ہیں تو شرافت سے چلے جائیں درز..."

"درز آپ بھی ساتھ چلیں گی۔!"

تمام لڑکے قہقہے لگانے لگے۔ باہرازیرب مسکراتی۔ پھر غصتے میں آگے بڑھی۔ وہ اسکو ڈر ڈھا کر لڑکوں کی ٹیم میں بیٹھ گیا۔  
ایک نوجوان نے کہا۔

"مستر آصف! آپ جیسا دلیر عاشق پہلی بار دیکھا ہے جو سب سے زیادہ مغrod لڑکی ہے، آپ اسی کو چھپ لئے ہیں۔"

آصف نے کہا۔

"اجی صاحب! اجھی آپ لوگوں نے میری دلیری کہاں دیکھی ہے۔ میں دُور سے اشارے نہیں کرتا۔ کسی لڑکی کو راستہ چلتے نہ چھیرتا ہوں، نہ اسے تماشہ بناتا ہوں۔ میں تو دلوں فیصلہ کرتا ہوں جسے چاہتا ہوں اس کے گھر میں گھس کر خشق کرتا ہوں۔"

ایک نے طنز کیا۔

"آپ دنیگیں مار رہے ہیں۔ کیا آپ اس مغrod لڑکی کے گھر میں جا کر اس سے عشق کر سکتے ہیں؟"

"ہوں... آصف نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ پہنچ کر باہراکی جانب دیکھا۔ پھر پڑ چھا۔" دوستو! اگر میں سر پر کفن باندھ کر اس کے گھر میں داخل ہو جاؤں تو کیا شرط ہاروں گے ہے؟"

”جو آپ کہیں گے۔“

”اچھا تو پانچ سیر مٹھائی خریدو۔ میں اپنے ہاتھ سے اس جینہ کا منہ میٹھا کروں گا۔“

ایک نے کہا۔

”بڑی خوش فہمی ہے۔ شرط ہارنے پر آپ مٹھائی کھلائیں گے۔؟“

آصف نے کہا۔

”یار دا شرط ہارنے پر تو میں لڑکی کے گھر سے جوتے کھا کر نکلوں گا۔ اگر مٹھائی کھانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ جوتے بھی کسانا پڑیں گے۔“

سب نے انکار میں سر بلایا۔ ایک نے کہا۔

”نہیں بھانی! ہارنے پر جوتے اور جیتنے پر مٹھائی آپ ہی کھلائیں گے۔ ہم صرف تما شہر دیکھیں گے۔ چلو یار پانچ سیر مٹھائی کے لئے چندہ کرو!“

ایک لڑکی نے لڑکیوں کی ٹیم میں پہنچ کر کہا۔

”کچھ سنا تم لوگوں نے۔؟ وہ جو آصف اسکو ٹردالا ہے نا۔ دہ آج بابری کے گھر میں گھسنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔“

”اچھا۔!“ سب نے تعجب کا اظہار کیا۔ بابری ہونٹ پہنچ کر غصے سے آصف کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ایک لڑکی نے

-L7

‘اس پدمعاشر کی پڑائی کرنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ کیوں  
بابر؟’

”آں۔۔۔“ بابر اکچھ سوچتے ہوتے ہوئے بولی۔۔۔ میرا خیال ہے کہ  
ہم سب مل کر اس کی مرمت کریں۔۔۔ تم سب میرا ساتھ دوگی تو مزا  
آ جائے گا۔۔۔“

"ارادہ کیا ہے۔؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

”نیکا ارادہ ہے۔ تریب آجاؤ۔“

دے سب قریب آکر باہر اکی رازدارانہ سرگوشیاں ملنے لگیں۔  
ھر سب نے تائید کی۔

”گڑ آئیڈیا — مزہ آجائے گا۔ اسے خوب کھلایا پلایا جائے گا۔ سپر سارا کھانا جو توں اور تپیلوں سے سفید کر لایا جائے گا۔“  
باہر آنے کے بعد۔

"او پھر نکالو پیسے ۔ چندہ جمع کرو ۔ ۔ ۔"

وہ سب اپنے پرس اور اپنی کتابوں سے دس دس کے ریک  
ایک دد دو کے نوبت نکالنے لگیں ۔

اٹھے میں بس آگئی ۔ لڑکے اپنی کار اور اپنے اپنے اسکو ٹھہر پر  
بیٹھنے لگے ۔ آصف نے سرگھا کر دیکھا ۔ لڑکیاں یکے بعد دیگرے  
بس کے اندر چاہ رہی تھیں ۔ باہرا نے آصف کی طرف دیکھا دونوں

نظریں ملیں۔ وہ مسکرانے لگی۔ پیچھے سے ایک لڑکی نے دھنکا دے کر کہا۔  
”ارے! تم تو یہیں سہیں رہی ہو۔“  
باہر ان بس پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔

”اری نہیں۔ اسے چارہ ڈال رہی ہوں۔“  
کار میں پیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے آصف سے پوچھا۔  
”کیا پچھن سکتے ہیں؟“

”نہیں۔ ابھی چارہ ڈال رہا ہوں۔“ آصف نے اسکو ڈر  
اسٹاٹ کیا۔ ایک نوجوان پیچھے آ کر پیٹھے گیا۔ بس آگے بڑھی تو  
اس کے آگے پیچھے کار اور اسکو ڈریں یوں دوڑنے لگیں جیسے بس میں  
پیٹھے والیوں کا ححاصرہ کر لیا ہو۔ بس کے اندر ایک لڑکی نے کہا۔

”ارے۔ یہ تو پونڈا فوج آ رہی ہے۔“  
باہر انہے کہا۔

”پردانہ کرد۔ با جماعت پٹائی ہوگی۔“  
کار ڈرائیور کرنے والے نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔  
”کیا خیال ہے۔ آصف شرط اجیت لے گا۔؟“  
اس کے ساتھی نے جواب دیا۔

”یہ بندہ مجنوں کا بھی باپ لگتا ہے۔ مجنوں پھر کھلانے کے لئے  
پاؤ نے سیلی اکھیا تھا۔ یہ مشہائی کھانے کے لئے اپنی عزت کو داد  
پر لگایا ہے۔؟“

آگے جا کر بس اور گاڑیوں کی رفتار بالکل ہی سنت ہو گئی  
کیونکہ سامنے سے برات آ رہی تھی۔ چھپوں سے بھی ہوتی کار میں  
دو ہما دلہن بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف نے اسکوڑ کو آگے بڑھا کر  
دیکھا۔ دلہن تو کوئی اور تھی۔ لیکن اسے باپرا دلہن کے بعد میں نظر  
آئی۔ دو بڑی چاہت سے اُسے دیکھنے لگا۔

با برانے بس کی کھڑکی سے جھانک کر گزرنے والی برات کو  
دیکھا۔ کار میں بیٹھا ہوا دلہما تو کوئی امداد نہ تھا۔ لیکن اسے آصف  
دو ہما کے بعد میں نظر آیا۔ باپر اس مکراتی ہوئی آنکھوں کے سامنے  
منظہ بدل گیا۔ دو سہماں کی یعنی پر دلہن بنی بیٹھی تھی اور آصف  
اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تحام کر اس پر جھمک  
رہا تھا۔

ان ان پرانی مسرتیں دیکھ کر اپنی مسرتوں اور آرندوں کے  
ہجوم میں جھنکتے لگتا ہے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان نے آصف کو  
جھنچھوڑ کر ہلو چھا۔

”جھائی خواب دیکھ رہے ہو کیا؟ دو بس نکلی جا رہی ہے：“  
اس نے اسکوڑ آگے بڑھا دیا۔

با برانے بس کی کھڑکی کے باہر گزرنے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی  
تھی۔ ایک سینما گھر کی پیٹھانی پر کسی فلم کا بہت بڑا بیز رگا ہوا تھا۔  
بیز کی تصویر میں ایک بچاں عورتاً ایک بچے سے بچے کو جوں رہی تھی۔

چشم زدن میں با برا نے اس اعورت کی جگہ خود کو دیکھا۔ وہ نہ بخے بچے کو کو چوم رہی تھی۔ اس کے بعد آصف بیک وقت اسے اور بچے کو بازوؤں میں سمیٹ کر جو منے لگا۔

پھر وہ چونک گئی۔ اس کی سہیلی پوچھ رہی تھی۔

"کیا خواب دیکھ رہی ہو؟ چلو انھوں اپنی منزل آ رہی ہے۔!"  
بس ایک اشناپ پر پہنچ کر رک گئی۔ لڑکیاں بس سے اُترنے لگیں۔ کاراڈا سکوٹر سٹرک کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ اور جوانوں کی فوج آصف کے اطراف جمع ہو رہی تھی۔ دوسرا طرف لڑکیاں ایک کنفکشنری کی دکان میں داخل ہو گئیں۔ ایک نوجوان کے سہما۔

"یار! یہ لڑکیاں بھی کھلنے کی چیزیں خرید رہی ہیں۔!"  
آصف نے کہا۔

"جذاب! آپ بھی یہاں سے پانچ سیر مٹھائی خرید لیں۔"  
وہ مٹھائی خرید نے چلا گیا۔ دسرے نے پوچھا۔  
"مشتر آصف۔!" آپ ایک نوجوان لڑکی کے گھر میں داخل ہونے والے ہیں۔ آپ کا دل تو ضرور کھرا رہا ہو گا۔؟"  
"گھر نے کی کیا بات ہے۔؟" آصف نے کہا۔ "اگر دباؤ لڑکی کے ماں باپ ہوتے تو میں شادی کا پیغام دے دوں گا۔؟"  
"اگر لڑکی نے تمہاری بے عزّتی کی تو۔۔۔؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم سب ایک عرصے سے ان لڑکوں کا چھاگر ہے ہو۔ ان پر آوازے کتے ہو۔ شارے بھی کرتے ہو۔ لیکن انہوں نے کبھی تمہاری بے عزتی نہیں کی۔ جانتے ہو کیوں۔"

ایک تھے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ یہ ہم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتیں؟"

دوسرا نے کہا۔

"ابے نہیں۔ یہ ہم سے ڈرتا ہیں۔"

"ڈکس بات کا۔؟" آصف نے کہا۔ یہ چاہیں تو انہی پنپل سے، اپنے والدین سے شکایت کر سکتی ہیں، ہمارے خلاف پر لیس ری امداد حاصل کر سکتی ہیں۔ بھیں کوڑوں کی سڑا دلو اسکتی ہیں۔ مجریہ ایسا نہیں کر سکیں۔ آخر کیوں۔؟"

"واقعی سوچنے کی بات ہے۔ آخر کیوں۔؟"

آصف نے کہا۔

"اس لئے کران کی زبان "اد نہہ" کہتی ہے۔ مجدد "ہائے"

کہتا ہے۔ یہ آنکھ اٹھا کر گھونٹ ہیں اور نظریں جھکا کر شرماتی بھی ہیں۔ یا روایہ جو کاجل لگاتی ہیں نا، یہ بنیائی کے بڑھانے کے لئے نہیں، ہمیں آگے بڑھانے کے لئے لگاتی ہیں۔ ہمیں لپیٹانے کے لئے ہونٹوں پر لالی لگاتی ہیں۔ دیکھو۔ ہم فولاد ہیں۔ قول اے۔

اپنی جگہ سے نہیں ہلنے — اگر کوئی مقناطیس بن کر سچیں اپنی طرف  
کیجئے لے تو قصور ہمارا ہو گایا مقناطیس کا؟"

"مقناطیس کا...." سب نے ایک زبان ہٹو کر کھا۔

تمام لڑکیاں دکان سے بھل کر ایک سمت جانے لگیں۔ آگے  
جا کر وہ ایک گلی میں ملا گئیں۔ نوجوانوں نے اپنی اپنی ہاتھیاں سنجھائیں  
جب وہ اس گلی میں پہنچے تو لڑکیاں دوسروی گلی میں ملا گئیں۔ اس  
گلی میں ایک چپر مٹاسا، خوبصورت سامکان تھا۔ باہرا تالا کھول  
کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے سچے لڑکیاں آتی ہوئی بولیں۔

"دادہ امکان تو بہت خوبصورت ہے۔ تھیاری اُمی اور  
آبا کہاں ہیں؟"

"دہالند کو پیارے ہو گئے۔"

"ادہ۔ تو تم یہاں تھیارہتی ہو۔؟"

"ہاں۔ یہی سمجھو لو۔ چپو جلدی سے میر پر کھانے کی چیزیں  
لے کھو۔ آسمہ، فریدہ تم کچن میں جا کر پلیٹیں لے آؤ۔ سلسلی! تم  
چانے تیار کرو گی، شھیک ہے۔"

تمام لڑکیاں مصروف ہو گئیں۔ کوئی کھڑکی کھول کر پردہ  
دست کرنے لگی۔ کسی نے چھت کے سکھے کو آن کیا۔ کوئی میر  
پلیٹیں لگانے لگی۔ باہرانے بڑے سے کیک پر تین موم  
بتیاں لگادیں۔ ایک لڑکی نے پوچھا۔

"یہ تین موم بیوں کا مطلب کیا ہوا ۔؟"

"مطلب یہ کہ میں اس گھر میں تین برس گزار چکی ہوں۔" اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ تمام لڑکیاں پابرا کو دیکھنے لگیں۔ وہ بولی۔

"دھونو۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔" آصف کی آواز سنائی دی۔ "آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود ہی آگیا ہوں۔" وہ مشہدی کا بڑا سا ذہبہ اٹھانے کرے میں آگا۔

ایک لڑکی نے جیرانی سے کہا۔

"ارے! یہ تو سچ پچ آگیا۔!"

آصف نے کہا۔

"پھر سوچ کر آگیا کہ اکیلا ہوں۔ اب یہ کوئی انصاف نہ ہو گا کہ تم سب مل کر مجھے اکیلے پر ہانتہ اٹھاؤ۔" پابرا نے کہا۔

"میں انصاف کر دیں گی۔ جاؤ اپنے ساتھیوں کو بھی ملا لو۔" آصف نے پوچھا۔

"یعنی کہ سب کے ساتھ انصاف ہو گا؟ آپ تو بہت سویٹ ہیں۔ جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ....."

وہ آگے بڑھا۔ پابرا پیچے ہٹ گئی۔ وہ بولا۔

”کوئی بات نہیں — واپس اگر جی چاہے گا — میں ابھی آتا ہوں — !“

”دہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ ایک لڑکی نے بابرائے پوچھا۔  
”کیا بات ہے ؟ دہ اتنی باتیں کہہ گیا اور تم چپ کھڑی ہو۔“  
”میں ایک ہی بارہ بولوں گی۔“  
ایک لڑکی نے کہا۔

”تم نے الفحاف کے لئے پوری نوج کو بلا یا ہے — ایسا نہ ہو  
کہ دہ سہم سے الفحاف کرنا شروع کر دیں۔“

ایک اور لڑکی نے کہا۔

”محجعہ تو ڈر لگ رہا ہے۔“

آصف کے پیچے دوسرے نوجوان آنے لگے۔ ایک نے کہا۔

”میں بھی ڈر لگ رہا ہے — ایکان سے ہم آتے نہیں لائے محجعے

ہیں — !“

بابرانے آگے بڑھ کر کہا۔

”کتنی عجیب بات ہے کہ آپ راستے میں چھپر چھاڑ کرتے ہونے  
نہیں لگتے — اور عجب گھر کی چار دیواری میں دل کی بات کہنے  
کا موقع آگے تو ڈرنا شروع کر دیتے ہیں — آپ سب اور  
بیٹھ جائیں۔“

دہ لوگ ایک طرف صوفیوں پر بیٹھ گئے — آصف بنے

لڑکیوں سے کہا۔

"تم سبِ ادھر بیٹھ جاؤ۔!"  
وہ سب دوسری ہرف صوفی پر بیٹھ گئیں۔ باہرا نے لڑکوں سے پوچھا۔

"کیا محبت کرنا جرم ہے؟"  
پاسکل نہیں۔ "سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔  
آصف نے لڑکیوں سے کہا۔

"ہم سے پہلے بھی یہ دنیا دا لے محبت کرتے آئے ہیں۔"  
باہرا نے لڑکوں سے کہا۔

"ہمارے ماں ہاپ نے، ہمارے بزرگوں نے بھی اپنی جوانی میں عشق کیا ہو گا۔؟"

"کیا ہو گا نہیں، کیا تھا۔ ان کے عشق نے ہمیں پیدا کیا ہے؟"  
جب محبت ہوتی آتی ہے اور ہوتی رہے گی، اور یہ جرم نہیں تو  
پھر کیا کیسا؟"  
آصف نے کہا۔

"ہاں اجرم اس وقت ہے جب تاک دونوں ہاتھ سے نہ بچے  
یعنی لڑکی راضی نہ ہو۔"  
باہرا لڑکوں سے بولی۔

"اور لڑکا اس سے راہ چلتے چھیر کر بدیشان بھی کرے اور بدنام بھی کرے

جانتے ہیں اس طرح کیا ہوتا ہے؟ آپ اس طرح دوسروں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ وہ بھی آپ کی بہنوں سے چھٹی رجھاڑ کیا کریں۔“  
وہ سب جھینپ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ یا پرانے کہا۔  
”دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کو اپنے گھر میں موقع دے رہی ہوں تاکہ آپ اپنی محبت کو سیر عالم نما شہر مذہبیں۔ یہاں آگے بڑھیں۔ جسے آپ چاہتے ہیں اس کے کان پیس پوچھیں۔“ دو یوں تو می۔“

آصف نے لڑکیوں سے کہا۔

”جسے منتظر ہو وہ مسکرا دے ۔ درد نہ کپھو دیئے ۔ ابھی تو  
پی نادان ہوں ۔“

سب لڑکیاں ہنے لگیں۔ ایک نوجوان نے کہا۔

”مسٹر آصف، پہلے آپ بابر سے پوچھیں۔ اب تلا آپ  
ندنوں سے ہوگی۔“

آصف اور بابرانے ایک دوسرے کو سنجیدگی سے مگرمت  
سے دیکھا۔ — وہ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے قریب آئے پھر سکر لکر  
ایک دوسرے کا ہاتھ نھام لیا۔ بابرانے کہا۔

”یہم نے مجنت کی منزل کو پا لیا ہے۔ یہ میرے سر تاج ہیں۔“  
آصف نے اسے قریب کھینچ کر کہا۔

سب کے سب حیرانی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔  
”پائیں۔! استلاح، شریک پا زندگی۔ یعنی کو صرف محبت  
ہی نہیں ہوتی شادی بھی ہو گئی۔؟“  
ایک بولی۔

”تو اچھا ہمیں بے دقوف بنایا جا رہا تھا؟“  
ایک بولا۔

”نہیں۔ یہ دونوں ابھی تک ہم سے مذاق کر رہے ہیں۔“  
ذہ دونوں میز کے دوسری طرف کیک کے پاس آ کر کھڑے  
ہو گئے۔ وہاں تین موم بتیاں لگی ہوتی تھیں۔ آصف نے  
باہر اکو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔  
”یہ مذاق نہیں ہے۔ آج ہماری شادی کی تیسرا سالگو  
ہے۔!“

”تیسرا سالگرد۔!؟“ سب نے مزید حیرانی کا اندازہ کیا۔  
بانبرا نے کہا۔

”ہاں۔ میرا اوند آصف کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔  
جب کوئی خوشی کا موقع آتا ہے تو ہم اداس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ  
ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ جب ہم خوش ہوں تو دوسرے لوگ ہماری  
خوشیوں کو دیکھیں اور ہماری ازدواجی زندگی پر دشک کریں۔“  
آصف نے کہا۔

”اس نے ہم نے سوچا اپنی خوشیوں میں آپ کو شرکیک کریں۔ آپ، جو محبت تو کرتے ہیں مگر محبت کے اظہار سے ڈرتے ہیں۔ آج ہم اپنی شادی کی تیسری سالگرہ کی خوشی میں آپ کو یہاں بلاکر یہ سہرا موٹ دے رہے ہیں۔ تم میں بھت ہے تو آگئے پڑھو اور محبت کرلو۔ درنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو۔“

ایک نوجوان نے کہا۔

”بھتی موقع تو خوب دیا ہے۔ دل خوش کر دیا۔“

دوسرا نے کہا۔

”مگر ایک ظلم بھی کیا ہے۔ ہمیں دھوکہ دیکر یہاں لے آئے ہم کوئی تخفہ نہ لاسکے۔“

آصف نے کہا۔

”آپ لوگوں نے کہا نے پسند کا اتنا سامان لا کر اپنا اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ گویا ہم آپ کی طرف سے تخفہ دعوی کر چکے ہیں۔“

اس دوران باہراموم بتیاں روشن کر چکی تھی۔ اس نے اور آصف نے پھوک مار کر مومن بتیاں بجھائیں۔ پھر دنوں ایک چاقو قعام کر کیک نہ لٹنے لگے۔ تایپوں کے شور میں مبارکباد کی آوازیں گوئیخونے لگیں۔ اس کے ساتھ ریکارڈ پلیر سے موسیقی کی آواز اجرنے لگی۔ موسیقی کی تال پر نوجوان جوڑے اور افعن منظر ہو گئے۔ ادھر ادھر رازدار اندر سرگوشیاں بیکھنے اور

بھٹکنے لگیں۔

”ڈو ڈو تو می...؟“

”نہیں نہیں — ابھی نہیں — ابھی تو میں نادان ہوں۔“

”ڈو ڈو تو می...؟“

”ذراد بکھوں گی، ذرا سمجھوں گی — پھر باں کھوں گی۔“

”ڈو ڈو تو می...؟“

”ہاں — ناں — ہاں — ناں — ہائے میں کیا کھوں۔؟“  
 رازدارانہ سرگوشیوں کے باعث ما حول بڑا دہان بردہ ہو  
 گیا تھا۔ دہان ایک جھوٹی سی خوبصورت سی دنیا آباد ہو گئی تھی  
 جہاں پیار کرنے والے کسی کو تپھر مار کر اشارے نہیں کرتے۔ ہر مرد  
 اور ہر عورت کے دل میں کسی کو چاہنے اور کسی سے چلہنے کی  
 آندہ ہوتی ہے۔ — دہان ایسی آرزوں کی تکمیل ہو رہی تھی۔ اگر ایک  
 دہرے کو سمجھنے اور سمجھو کر انکا رکار لے یا اقرار کرنے کے موافق فراہم  
 کئے جائیں۔ باہمی سمجھوتہ کی راہیں ہمارے کی جائیں تو کسی سنواری کا  
 آنچل میلا نہ ہو۔ اور کوئی دل والا را ہ چلتے کسی کو چھپیر کر کوئوں کی  
 سزا تک نہ پہنچے۔ کیونکہ کوئوں کے محبت کی نہیں، گناہ کی پیٹھ پر  
 لگائے جاتے ہیں۔

دلتے جا رہی تھی۔ خوابگاہ میں زبرد پادر کا بلب اونگھ رہا تھا۔ آصف اور بابرا آرام دہ بستر پر ایک دوسرے کی آغوش میں سو رہے تھے۔ جہاں دو بدن کی طرح دو دل بھی ہم مزاج ہو کر ملتے ہوں دہان گھری نیند آتی ہے۔ ابھی ان کے درمیان ظالم سماج کی بیان ظالم حادثہ کی کوئی دیوار کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تقدیر ہر بان تھی۔ اور جب تقدیر ہر بان ہو، تو انسان کو تھپک تھپک کر آرام سے سلاطی رہتی ہے۔

پھر اچاک یوں لگا۔ جیسے تقدیر نے ہولے ہولے رذنا فروع کر دیا ہو۔ بابرا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چند لمحوں تک جوں کی توں پڑی رہی۔ کچھ پہلیشان سی ہو کر دہ آواز شستہ لگی۔ پچ پچ رونے کی آواز تھی۔ کوئی بچہ رورہا تھا۔ اس نے آہنگ سے آصف کے

ہاتھ کو اپنے بدن پر سے ٹھایا۔ پھر انہ کر پیچہ گئی۔ سامنے دیوار پر ایک خوبصورت بچے کی تصویر آدمیاں تھیں۔

بچہ اب زور زور سے رو رہا تھا۔ وہ لستر سے انزوا کر آئی۔ آئتھے چلتی ہوئی خواب گاہ سے باہر آگئی۔ دہان ایک خوکیں ہیں بچوں کے بہت سے کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بچہ اس کے اندر کہیں رو رہا ہے۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے پڑیا نی کے عالم میں مکان سے باہر آگئی۔ پھر نیم تاریکی میں ایک سمت بڑھنے لگی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ رونے کی آرائ قرب آتی جا رہی تھی۔

پھر وہ ایک مکان کے دردارے پر پہنچ گئی۔ اندر سے ایک بچے کے رو نے کی آرائ سلسل آرہی تھی۔ اس نے کال بیل کے ٹین پر انٹلی رکھ دی۔ اب اندر سے گھنٹی کی آرائ بھی آرہی تھی۔ دو چار بار گھنٹی بجانے کے بعد کسی مرد کے بڑا نہ کی آرائ سنائی دی۔ وہ کیا صیبت ہے۔ آرام سے سونے بھی نہیں دیتے۔ وہ بچے رات کو ملنے پلے آتے ہیں۔

در دازہ کھل چیا۔ بچے کے رو نے کی آرائ اور زیادہ واضح ہو گئی۔ در دازہ کھولنے والے ادھیر عمر کے آدمی نے آنکھیں ملتے ہوئے بابا کو دیکھ لکھا۔

وہ اچھا۔ تو پڑوسن صاحبہ ہیں۔ کیا آپ صبح ملاقات نہیں

کر سکتی تھیں۔؟”  
بابرانے کہا۔

”جی ہاں ! مگر وہ آپ کا بچہ رہ رہا ہے۔“

”ہاں — وہ تو رہا ہے۔ مگر آپ کو کہا تکلیف ہے ؟“  
”بچے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بچہ بُک رہا ہے۔ اسے دو دعو  
ہی پلا دیں۔“

”دو دھپلا دوں — یعنی کرمیں، یہ کیا مذاق ہے۔ دو دھ اس  
کی ماں پلاتے تھی۔“

”تو آپ اس کی ماں کو نیند سے بیدار کریں۔“

”ایں — نیند سے جگاؤں۔؟ اگر دھ ناراض ہو کر میکے چلی جائے  
گی۔ تو کیا میرا لھر برپا دکر کے آپ کو خوشی ہوگی۔؟“

”آپ عجیب آدمی ہیں۔ بچہ بھوک سے نہ تا رہے گا۔ اور آپ  
انپی بیوی کی نیند میں خلل پیدا کر کے اسے ناراض نہیں کریں گے۔  
نہیں کروں گا۔ وہ میرا بچہ ہے۔ اسے بھی رفتہ رفتہ میری طرح  
صبر کرنے کی عادت ہو جائے گی۔ لیں آپ جائیں۔ ہماری نیند  
خراب نہ کریں۔“

وہ دروازہ بند کرنے لگا۔ بابرانے دروازے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ٹھہریئے۔ آپ انپی بیوی کو ناراض نہ کریں۔ میں جا کر جگا  
دیتی ہوں۔!“

”آپ — آپ اتنی رات کو میرے گھر میں آئیں گی۔ میری گھروالی نے دیکھ لیا تو.... تو معاف کیجئے گا۔ میری آبرو صرف میری بیوی کے لئے ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے دروازہ ایک دھڑا کے سے بند کر دیا۔ اسی وقت اندر سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔  
”کون ہے؟ ادھو، ہو، میرا منوار و رہا ہے۔ میں اپنے راجہ بیٹے کو ابھی دودھ پلاوں گی۔ اوہو، ہو، باہر کون ہے؟“  
باہر امطہن ہو کر دہال سے دالپس جانے لگی۔ مرد کی آواز سنائی دی۔

”کوئی نہیں۔ میں ہوں بیگم۔ باہر کا دروازہ بند کر رہا ہوں۔“  
”اتنی رات کو نہ دانہ کیوں کھولا تھا؟“  
”وہ.... بات یہ ہے بیگم کہ... ایک سبکاری آیا تھا۔ میں نے اسے بھگا دیا۔“

”آیا تھا یا آئی تھی؟“ جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔ اتنی رات کو کونی بھیک مانگنے آتا ہے یا بھیک دینے آتی ہے؟  
باہر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے مکان کے احاطے میں داخل ہوئی۔ آصف دونوں ہاتھ باندھے دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اب پڑوس کے مکان سے لٹلنے چکر ٹنے اور چیزوں کے گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دے رہیا تھیں۔ باہر اب آمدے کے سرے

پر بیٹھ گئی۔ آصف نے کہا۔

”کسی سے ہمدردی کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔“

”میں کیا کروں۔ وہ معصوم بچہ جانے کتنی دیر سے رورہا تھا۔“  
”تو کیا ہوا۔؟“

باہرانے سراٹھا کر آصف کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اس کے ساتھ ہی بابراک آنکھیں بعیگ گئیں، وہ بُوی۔

”میرے اندر بھی کوئی رورہا تھا۔“

آصف نے اسے گھری سنجدی سے دیکھا۔ چراس کے پاس ہگر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ کو محبت سے تحام کر بولا۔

”ابھی تو ہماری شاہدی کو صرف تین سال ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی تمہاری آرزو پوری ہوگی۔“

”اللہ کب چاہے ہے چکا۔؟“

”کون جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کون کی ہات کب منتظر ہوتی ہے۔“ وہ ایک چھری سانس لیکر بولا۔ لیڈی ڈاکٹر نے تو ہبھتے کر تم میں بن سکتی ہو۔“

”تم بھی تو باپ بن سکتے ہو۔“

”ہاں۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کسی ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کراؤں۔“ ہو سکتا ہے کہ مجھے میں کوئی خرابی ہو۔“

”خدا نہ کرے کہ کوئی خرابی ہو۔ تم کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جانا۔“

”کیوں نہ جاؤں؟“

”لبس یوں ہی۔!“

”نہیں۔ تمہارے اختراہ کی کوئی دلجر تو ہوگی؟“

”میں لپڑی ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے سوچتی تھی کہ شاید میں بانجھ ہوں۔ کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔ کسی طرح صبر کر لیتی تھی۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے کہا، میں ماں بن سکتی ہوں، صبر نہیں ہوتا۔ ہر دم یہی بے چینی کی رہتی ہے کہ آپ وہ مبارک گھر ہی آئے گی؟“

”ہاں بوجی! یہ یقین ہے جانے کہ منزل ملے گی اور چھر بھی منزل سامنے نہ آئے تو صبر نہیں ہوتا۔ دل کی بخوبی حالت ہو جاتی ہے۔“  
بابرا نے کہا۔

”لیکن چھر بھی یقین رہتا ہے کہ کبھی نہ کچھ تو منزل ملے گی۔ خدا نہ کر ڈاکٹر نے اگر کہہ دیا کہ آپ باپ نہیں بن سکتے تو رہا سہا یقین بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگا۔“

”ڈاکٹر تو وہی کہے گا جو پچ ہو گا۔ کیا پچ سننے کا حوصلہ نہیں ہے؟“  
”جو حصے کی بات نہیں ہے آصف! بہت سے لوگ امید پر زندہ رہتے ہیں۔ تم ڈاکٹر سے چیک اپ نہیں کراؤ گے تو ہمارے درمیان امید کی کرن ہمیشہ جگہاں قی رہے گی۔“

”یہ تو خود کو دھو کر دینا ہوا۔!“

”کبھی کبھی خود کو دھو کر دیکھنے کا حوصلہ پیلا کیا جاتا ہے۔ مجھے

اسی طرح بیٹے دو آصف ! ”

اس نے اپنا سر آصف کے شانے پر رکھ دیا۔ آصف گھری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ وافحی زمین نہ خیز ہے۔ کسی موسم میں بھی فصل آگاتی جا سکتی ہے بشرطیک کسان کے پاس جو زرع ہیں، ان میں بچلنے پھولنے کی صلاحیت ہو۔ تھیک ہے کہ زمین اپنے پیغام کا طبق معاونت نہیں چاہتی۔ لیکن کسان کو اپنی خوبیوں اور خامیوں سے باخبر رہنا چاہیے۔

بابرا نے پوچھا۔

”آپ کیا سوچنے لگے؟“

”بوبی! اللہ جو کرتا ہے وہ چھاتی کرنے کرتا ہے۔ شاید ہم اس لئے ابھی پچھے سے محروم ہیں کشمکشم تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ یہ تمہارا آخری سال ہے۔ تمہارے بیکھڑا ادھر تمہارے فاسیل اپر کا شاندار رذلت نکلے گا ادھر تم شاندار نہ ہامنہ سازدلت آؤٹ کرو گی۔“

وہ مسکرا نے لگی۔ بھروسی۔

مکمل سے کامیج میں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جاتے گا۔ آج ہماری ساکھرہ کی پارٹی میں جو لوگ کیاں شرکپ ہو گئی ہیں وہ سارے کامیج میں مشہور کردیں گے کہ میری شادی ہو گئی ہے۔!“

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ شادی کی بات نہ چھپاؤ!“

”آپ نہیں جانتے۔ اگر کامیج میں یہ خبر پھیل جائے کہ کسی لڑکی کی

شادی ہر چکی ہے تو ساری لڑکیاں اس کے پیچے پڑ جاتی ہیں۔ میاں بیوی  
کے بارے میں کریم کریم پوچھنا شروع کر دیتی ہیں۔ ।

”اچھا! تو اب لڑکیاں تم سے بھی پوچھا کریں گی۔؟“

”اور نہیں تو کیا — بڑی رازداری سے پوچھتی ہیں۔؟“

”کیا پوچھتی ہیں۔؟“

”ساری لڑکیوں کو ایک ہی فکر ستاتی ہے کہ سہاگ رات میں  
کیسے ستاتا ہے؟“

”تم کیا جواب ددگی؟“

”میں کہوں گی۔ میری سہاگ رات کو تین برس گزر چکے ہیں میں  
ساری باتیں بھول چکی ہوں۔“

”اے! ایسا بھی کیا بھولنا؟ چلو ابھی رات باقی ہے۔ میں  
تمہیں یاد دلادوں۔!“

اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا تودہ ثرماتی ہوئی اس کی آنونش میں پہنچ  
گئی۔ سہاگ رات عورت کی انقدر گئی کی سب سے اہم اور یادگار رات ہرتی  
ہے۔ عورت اسے یاد کر کے بڑھاپے میں بھی ثرماتی ہے۔

پندرہ

مکان کے اعلیٰ میں آصف اپنے اسکوٹر کی صفائی کر رہا  
تھا۔ اس سے کچھ ناصلی پر ۔۔۔ مالی با غصہ میں ایک پودا لگا رہا تھا  
آصف نے مکان کی طرف گھوم کر آواز دی۔

”بوی! کہاں ہو؟ ہری آپ تمہارے کالج کا دقت ہو گیا  
ہے۔“  
اسد سے آواز آئی۔

”بس ابھی آتی ۔۔۔ جست اے منٹ...“  
آصف انتظار کی گھڑیاں گزارنے کے لئے ٹھلنے ہوئے دنگ برلنگے  
چھولوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک سوکھے ہونے پے پودے کو دیکھ کر بدمچا۔  
”مالی! یہ پودا تو مر جا گیا ہے۔ میں نے کبھی اس میں چھول کھائے  
ہوئے نہیں دیکھا۔“

"صاحب! یہ اگر ناکارہ ہو تو پودے لیے ہی مُرجھا جاتے ہیں۔ اور ایک پھول بھی نہیں کھلتا۔"

مالی کے جواب نے آصف کو چونکا دیا۔ اس نے پوچھا۔

"تو پھر پھول کیسے کھلتے گا۔؟"

"صاحب! یہ بدن ہو گا۔"

آصف نے پلٹ کر دیکھ لے یا اپنا باہر آگرد روازے پر نالا گارہ تھی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا پھولوں کا معاشرہ ہو رہا ہے؟"

آصف نے کہا۔

"ہاں۔ زمین کا یہ حضنہ خالی ہے، یہاں پھول نہیں کھل رہے ہیں۔"

وہ قریب آتی ہوتی بولی۔

"تو کیا ہوا، کھل جائیں گے؟"

آصف نے کہا۔

"مالی کا کہنا ہے کہ دوبارہ زمین ہمرا در کر کے دوسرا یہ ڈالا جاتے۔ اس کے بعد پھول کھلیں گے؟"

وہ بولی۔

"ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ مالی کو پہلے ہی یہ بدل دینا چاہیے تھا۔"

وہ کہتے سہتے کھلی گئی۔ کبھی مُرجھا نہ پوچھوں کو اور کبھی آصف کو دیکھنے

لگی۔ پھر اس نے کھڑی سنجیدگی سے کہا۔

”مالی! یہ پودا ایسے ہی رہے گا۔ سچ بدلا نہیں جائیگا۔ زمینیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے پودے کے قدموں سے لپٹتی رہتی ہیں۔ خواہ پھر اس کھلے یا نہ کھلے۔ . . . .“

وہ نیزی سے چلتی ہوئی اسکوٹر کے پاس آگئی۔ آصف بھی خاموشی سے اسکوٹر پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ اسکوٹر آگے بڑھ گیا۔ راستے میں بابرا نے پوچھا۔

”آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”تم بھی تو چُپ ہو!“

”میں سوچ رہی تھی۔ میں ہی اتنکا ماں بننے کی خواہش کر رہی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ آپ بھی باپ بننے کے لئے اندری اندر طلب رہے ہیں۔ ایک مشروع روں؟“

”میں سن رہا ہوں۔“

”شاپید ہمارے ستارے آپس میں نہیں ملتے۔ اگر آپ دوسرا شادی کر لیں تو باپ بننے کی خواہش پوری ہو جائے۔“

”سچ پوچھو تو یہی مشروع ہیں تمہیں دینا چاہتا ہوں۔“

”فضول باتیں نہ کریں۔“

”سچ کہتا ہوں۔ میری جگہ کوئی دوسرا شوہر ہر تبا تو تم غین برس میں تین بچوں کی ماں بن جائیں۔“

”گاڑی روکیں۔“

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی وہ غصہ سے بولی۔

”گاڑی روکیں۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔“

”ناراض کیوں ہو رہی ہو۔— میں نے گالی تو نہیں دی دی ہے۔“

”آپ نے گالی دی ہے۔— گاڑی روکئے، نہیں تو چینا شروع کر دیں گی۔“

اس نے گاڑی رد کی۔ وہ گاڑی سے اتکر لولی۔

”آپ کو شرم نہیں آتی۔ اپنی بیوی کو دوسری شادی کا مشورہ دے

دے ہیں۔؟“

”پہلے تمہیں شرم آنی چاہئے۔ پہلے تم نے مشورہ دیا تھا۔“

”اولاد نہ ہو تو مرد دوسری شادی کر سکتا ہے۔“

”اور دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہو نو۔؟“

”ضرور ہوگی۔!“ وہ ملنہ پھیر کر ملک پر جبر کرتی ہوئی بولی۔ ”آپ دوسری شادی کر لیں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔

”اگر تمہاری ناراضگی اسی طرح درست کیتی ہے تو میں ہی کیا تم اپنے سوتیلے بچے کو گود میں کھلاو ڈیں۔؟“

بایہر انہے پلٹ کر اسے سمجھیدگی سے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے یانوں کو محبت سے تحام کر لولی۔

” میں جو ایک بچے کی آنند کرتی ہوں تو میرے خوابوں میں اور خیالوں میں وہ آپ ہی کا بچہ ہوتا ہے — میں صرف اسی بچے کو سینے سے لگاؤ گی، جو آپ کا ہو گا — خواہ وہ مجھ سے ہو یا میری سوکن سے ..... ”  
وہ باتھے بڑھا کر بولा۔

”اچھا تو وعده؟“

وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

وَعْدًا

”چلو اب گاڑی پر بیٹھو جاؤ — دیر ہو رہی ہے۔“  
وہ پچھے بیٹھ گئی۔ گاڑی استارٹ ہو کر سڑک پر دوڑنے لگی۔  
آصف عقب نما آئینہ میں باپر اکو دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکلتے ادا سی  
سے سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اور ٹوٹی ہوئی  
باتیں اسے سمجھا رہا تھا۔ یہ مرد کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔  
میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آصف میرے سوا کسی دوسرا لڑکی کا تصویر  
یکھی کر سکتے ہیں۔ سرگرد بیکھو تو کتنی جلدی دوسرا شادی کرنے راضی ہو گئے  
ہیں۔ جیسے پہلے سے تیار بیٹھ ہوتے تھے۔ میری طرف سے اجازت  
ملتے ہی مجھ سے پکا دندھ لے لیا۔ . . . .

شام کو اس خیال کی تصدیق ہو گئی ۔ وہ کچن میں مصروف  
نہی کہ ڈرائیک ردم سے آصف کی آواز آئی ۔

بوبی! تم کہاں ہوے؟ دیکھو میں نے اپنا دعوہ پورا کر دیا ہے

.... دوسری گھروالی لے آیا ہوں۔؟

"دوسری گھروالی —؟" بابرائے پرلیٹان ہو کر دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتی ہوئی کچن سے باہر آئی۔ ڈرانگ روم میں آصف کے ساتھ ایک لڑکی سرخ جوڑا پہنے، گھونکٹ لکالے اور سر جھکلاتے کھڑی تھی ان کے آس پاس آصف کے چند دوست تھے۔  
بابرا ڈرانگ روم میں ہینچ کر ٹھیک گئی تھی۔ آصف کے ایک دوست نے کہا۔

"بھاپ! خدا آپ جیسی بیوی سب کو نصیب کرے۔ آپ نے کتنی فراخدلی سے آصف کو دوسری شادی کی اجازت دی ہے۔ اب اس خوشی کے موقع پر ایک شاندار پارٹی ہونی چاہیئے۔"  
آصف نے کہا۔

"کل دلپیہر کی دعوت ہوگی، ہاں بوبی! اس خوشی میں تم سب لوگوں کو چاٹے پلا دو۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ مجھے اجازت دو۔ میں نہ دوسری والی کے ساتھ مصروف رہنا چاہتا ہوں۔ او کے۔ گذبائی .."  
دہ نئی دلہن کو سہارا دیکر خواب گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ بابرائے تیزی سے آگے بڑھی۔ پھر خواب گاہ کے دروازے پر راستہ روک کر لولی۔  
"خبردار! یہ میرا کمرہ ہے۔۔۔ بہاں کوئی دوسری قدم رکھے گی تو میں مانگیں توڑ دوں گی۔"

آصف نے جیرانی سے پوچھا۔

”اے تو کیا تھا راوی دعویٰ تھا؟“

”آپ نے بھی تو شادی کی رات دعویٰ کیا تھا کہ میرے سو اکسی دوسری کامنہ نہیں دیکھیں گے۔“

”لیقین کر دبوی! میں نے اس گھونگھٹ والی کامنہ بھی نہیں دیکھا ہے۔ تمہاری اجازت سے ہی دیکھنے پہاں لایا ہوں۔ اور تم تو اجازت سے چکلی ہو۔“

”ہاں! اجازت در سے چکلی ہوں۔ مگر اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔“

”دہ غصہ سے طنطناقی ہوتی جانے لگی۔ آصف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

”بھائی، سنو تو! یہ دوسری والی ہمیشہ پہاں نہیں رہے گی۔“  
”دہ غصہ سے بولی۔

”یہ ایک منٹ بھی پہاں نہیں رہے گی، جہاں سے بیاہ کر لانے ہیں اسے دہیں لیجایں۔“

”وہاں والے اسے دالپس نہیں لیں گے۔ ہاں اگر ایک سال کے اندر ہمارے گھر میں ایک نئی منٹ سے بچے کا اضافہ نہیں کرے گی تو دالپس کر دی جائے گی۔“

”کیا مطابق۔؟“ باہر اُنے چہارانی سے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ تمہیں ایک بچے کی ضرورت ہے۔ شرط یہ ہے کہ

وہ بچہ میرا ہی ہو۔ اس لئے میں اسے پورے ایک سو ایک روپے میں خرید کر لا یا ہوں۔

”خرید کر لائے ہیں؟“ وہ زید جیرانی سے پوچھنے لگی۔ ”کہاں سے؟“  
”ایک فیکڑا می سے۔ نیکڑی دالوں نے ایک سال کی گازٹی  
دی ہے۔ بچہ ضرور ہو گا۔“  
وہ جتنا کرنے والی۔

”آپ سید صی طرح نہیں بتائیں گے۔ میں اسی حرام نادی سے  
پوچھوں گی۔“

اس نے آگے بڑھ کر دہن کے گھونگھٹے کو نیچ لیا۔ گھونگھٹ  
کے پیچے ایکہ سیجرہ انظر آیا۔ وہ تالی پیٹ کر لولा۔  
”اے بی بی! سوکن سے ایسا بھی کیا جلتا۔ تجھے ہمارے ہونے  
والے بچے کا دامسطہ، میرے سرے کے پھول تو کھلنے دے۔“  
بابرا نے نڑاخ سے اس کے منہ پر طانچہ سید کیا ہے وہ  
دوسری طرف گھوم گیا۔ — پھر وہ آصف کی طرف بڑھی۔

”اچھا تو تم میرا مذاق اثار ہے نتھے؟“

آصف پیچے پہنک کر لولہ۔

”دیکھو بپھلے میری بات سنو!...“

”میں کچھ نہیں سُننا چاہتی۔“

پھر وہ آگے بڑھی۔ سیجرہ آصف کے آگے سینہ پر ٹوکر پولہ۔

” اسے بی بی اکیا مجھے بیوہ بنانا پا ہتا ہے ؟ قسم ہے مجھے اپنے ہبھاگ کی ” میں اپنے شوہر کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ ..... ”

تراخ سے پھر ایک طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ آصف کے دہرے دوستہ بیچ بچاؤ کے لئے دورے آئے تو باہر اُنے ان پر سمجھی بلی کی طرح پہچنے مارے۔

” میں تم لوگوں کو الیسی شاندار پارٹی دوں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔ ”

” وہ ایک گلدان اٹھا کر مارنے کے لئے دوڑی ۔ آصف اسے پکڑ کر کھینچتا ہوا دوسرا کمرے کریے میں لے گیا۔

” کیا پاسکل ہو گئی ہو ۔ ۔ ۔ ”

” جھوٹ دیجئے مجھے ۔ ۔ ۔ میں آپ کو غصہ نہیں دکھا سکتی ۔ ان لوگوں پر تو غصہ آنا سکتی ہوں ۔ ۔ ۔ ”

آصف نے دوستوں سے کہا۔

” دُرنے کی بات نہیں ہے ۔ ۔ ۔ آرام سے بیٹھو، میں ابھی چلتے پلاوں گا ۔ ۔ ۔ میں ایک منٹ ۔ ۔ ۔ ”

یہ کہ کرو اس نے دروازہ بند کر دیا، وہ بولی۔

” دروازہ کھو لئے ۔ ۔ ۔ ”

” کیا تمہیں اس بات پر غصہ آ رہا ہے کہ میں نے پہنچ پہنچ شادی نہیں کی ۔ محض مذاق کیا ہے ۔ ۔ ۔ ”

”آپ نے مذاق نہیں کیا ہے میرا مذاق اڈا رہے ہیں کہ میں کچھی  
ماں نہیں بن سکتی۔“

”نہیں۔۔۔ میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ عورت جتنی فراخ دلی سے  
دوسرا شادی کی اجازت رتی ہے۔ تھی فراخ دلی سے اپنی سوکن کو برداشت  
نہیں کر سکتی۔۔۔“

”اس لئے کہ میں اپنے پیار میں کسی کو شریک نہیں کر سکتی۔“

”تو کیا میں ہی بھڑکے کو شریک کرتا ہوں؟“  
وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ آصف نے کہا۔

”منہی تو چھپی۔۔۔۔۔۔“

پیر کہہ کر اس نے بوبی کو آغوش میں سمجھیٹ لیا۔ اس کے چہرے  
پر جگنے لگا۔

ڈرانگ روم میں بیٹھے ہوئے دوست جاہیاں لینے لگے۔ ایک  
نے کہا۔

”پہہ نہیں چانے کب آئے گی۔۔۔؟“  
دوسروے نے کہا۔

”بھی چاٹے ابھی گرم ہو رہی ہے۔۔۔  
ہی بھڑکنے تالی پیٹ کر کہا۔

”اے! وہ تو بہت ہم اگرم تھی۔ آصف میاں ٹھنڈی کر رہے ہیں۔“

ہسپتال کے ایک دارڈ میں مختلف مریضوں کے لبرٹریوں کے  
اطراف بہت سے عیادت کرنے والے رشتے دار جمع تھے۔ آصف  
بھی ایک مریض کی عیادت کے لئے آیا تھا۔ اور اس سے مسکل کر رہا تھا  
کہ رہا تھا۔ ایک دارڈ بوائے نے آگر پوچھا۔

”جناب! کیا آپ ہی آصف صاحب ہیں؟“

”ہاں۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔؟“

”جناب! لیڈری ڈاکٹر کا حکم ہے کہ آپ ہسپتال سے باہر  
چلے جائیں۔۔۔“

”کیا مطلب؟ نیعنی کہ میں کیوں چلا جاؤں؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔۔۔ ہاں آننا جانتا ہوں کہ جسے وہ پسند  
نہیں کرتی ہیں۔ اسے ہسپتال میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتیں۔“

”دہ ڈاکٹر ہے یا ہسپتال کی ملکہ عالیہ؟ کہاں ہے دہ؟ میں اس بدغیری کی وجہ معلوم کروں گا۔ چلو میرے ساتھ۔“

دہ وارڈ بوانے کو دھکادے کر دارڈ سے باہر آیا۔ دارڈ بوانے نے کہا۔

”صاحب! آپ مجھے کیوں غصہ دکھان رہے ہیں۔“ دہ رہا ڈاکٹر صاحبہ کا کفرہ۔ آپ ان سے جاکر پوچھ لیں۔“

آصف غصہ سے طنطنا تاہو اکرے میں داخل ہوا۔ لیڈی ڈاکٹر اس کی جانب پشت کئے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ آصف نے پوچھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے ہسپتال سے باہر جانے کے لئے کیوں کہا عاریا ہے؟“ جواب ملا۔

”اسکے لئے کہ تم جھوٹے، بے ایمان اور دغا باز ہو۔“

دہ غصہ کو برداشت کرتا ہوا بولا۔

”ڈاکٹر! یہ الزامات ثابت کر دے، مدد میں تمہیں اٹھا کر کھڑکی سے باہر کھینک دوں گا۔“

”مجھے اٹھا کر کھینکنے کے لئے قریب آنا ہوگا۔ اور میں یہی چاہتا ہوں کہ تم کسی بہانے نے قریب آجائے۔“

دہ دونوں بانہیں پھینکا کر آصف کی طرف گھوم گئی۔ دہ چونک کر بولا۔

“اے انہم تم تم یہاں۔؟”  
 ہاں۔؟ اسے محبت کی انتہا کہتے ہیں۔ کچھ دھاگے سے  
 بندھی ہوئی لاہور سے یہاں آگئی ہوں۔”  
 آصف نے پرائیز ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے کے بعد کہا۔  
 ”خدا کے لئے اب عشقِ محبت کی پانیں نہ چھپڑو۔ میری بیوی بھی  
 یہاں موجود ہے۔”

”بیوی سے اتنا فائدہ تے ہو تو مجھ سے محبت کیوں کی جھی؟”  
 ”بے شک میں شادی سے پہلے تمہیں پسند کرتا تھا۔ اور شادی  
 سے پہلے سینکڑوں لڑکیاں پسند آتی ہیں۔ اسے جوانی کی بھول بھی کہہ سکتی  
 ہو۔ لیکن میں نے ایسی بھول نہیں کی۔ جب پر مجھے شرمدہ ہزاڑ پڑے۔”  
 ”میں تمہیں شرمدہ نہیں کر رہی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی  
 کہ میں نے تمہاری خاطر اب تک شادی نہیں کی۔ اور تمہاری ہی خاطر  
 ڈرانفر کر کر یہاں آئی ہوں، میرے وحید بھائی جان بھی اسی ہی پیال  
 میں ہیں۔”

دوسرے کمرے میں وحید ایک ڈاکٹر کے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا۔  
 ”خیاباب! آپ لوگوں کی ہمارانی سے یہاں کے تمام مریض میری  
 ہی دکان سے روایتی خریدتے ہیں۔”  
 ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

”رسیں ہمارانی کی کیا بات ہے۔ آپ کی دکان ہسپتال کے املاطے

میں ہے۔ ملینگوں کو یہاں سے دوائیں خریدنے میں سہولت ہوتی ہے۔“  
دھیدر بھیکھاتے ہوئے بولا۔

”مسٹر د جیمڈ ! میں ایک ذمہ دار ڈاکٹر ٹھہرے ہوں ۔ منشیات کا دلال  
نہیں ہوں ۔ اگر آئندہ آپ نے ایسا منورہ دیا تو میں آپ کا لس  
کیسل کر دوں گا۔“

”آے آپ تو ناراض ہو گئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے  
کہ ”

اس کی بات ادھر ری رہ گئی۔ باہر اڈاکٹر کو مخاطب سرتی ہوتی  
کمرے میں داخل ہوئی۔

ڈاکٹر دس نمبر وارڈ کے ایک مریض کی حالت خراب ہے۔ اور  
نرس اسے ایئنڈ نہیں کر رہی ہے۔ پلینر! آپ اسے ایئنڈ کروں۔  
ڈاکٹر فوراً ہی انہوں کھڑا ہوا۔ اسی وقت وحید نے مسکرا  
کر کہا۔

سہیلو بولی ۱

بوبی نے چونک کر دیکھا۔

"وجید — ا تم — تم یہاں — ؟"

"شکر ہے کہ تم نے مجھے بھلا بیا نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کمرے سے جا چکا تھا۔ بوبی وجید کو غصتے سے دیکھنی ہوئی  
جانے لگی۔ نہ داستہ روک کر لولا۔

"کیا نارا ض ہو — ؟"

"تم سے نارا ض ہونے یا خوش ہونے والا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔"

دہ آیک طرف ہو کر لولا۔

"میں تو اس لئے روک رہا تھا کہ تمہاری ایک تصویر میرے پاس  
لے گئی ہے۔"

وہ کمرے سے باہر جاتے جاتے ٹھٹھک گئی۔

"کیسی تصویر — ؟"

"آرام سے بیٹھو۔ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی۔ تمہیں یاد  
ہو کر نہ یاد ہو۔ میں یاد دلاتا ہوں۔"

بوبی نے اسے گھری سنجید گی۔ تد دیکھا اپھر ایک کرسی پر بیٹھ  
گئی۔ وجید نے کہا۔

"میں اس تصویر کو سمجھنے سینے سے لگاتے رکھتا ہوں۔"

"یہ دیکھو۔"

اس نے قمیص کی اور پرنسیپ جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کی  
طرف بڑھا دی۔ بوبی نے اسے لیکر دیکھا۔ تصویر میں بوبی تھی۔  
وجہ دنے اس کے ہاتھوں کو تھام رکھا تھا۔ دونوں رہبر نے اور  
ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکا۔ ہے تھے۔  
اس ایک تصویر سے یادوں کی الہم کے ادراق تحلیل لگے۔ ماضی  
کی کتنی بھی تصویریں لگا ہوں کے سامنے آنے لگیں۔ انسان کی جوان  
میں دُد اہم عدد تھے ہیں۔ ایک دُور شادی سے پہلے۔ دوسرا  
شادی کے بعد آتا ہے۔ شادی سے پہلے لوگوں کی طرف کوں  
کو پذریگی کی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ کیونکہ پذیریگی کے دوران  
ہی خوب سے خوب ترجیون ساتھی ملتا ہے۔ وجید نے بوبی  
کو جب شرکی چیات بنانے کا وعدہ کیا۔ تو وہ وعدے کے فریب  
میں آگئی۔

پہلے پہل وجید کے دخترے میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ وہ  
پسک پسک اسے دل دجان سے چاہتا تھا۔ جیسے جنگل میں مور ناچتا  
ہے ویسے ہی بوبی اس کے خیالوں کے جنگل میں ناچتی تھی۔ لیکن  
جلد ہی ناچتے ہوئے مور اور مورنی کو اپنے بھائے پاؤں نظر آئے۔  
بوبی غریب ماں کی بیٹی تھی۔ بوری ہاں بڑی محنت و مشقت کے بعد  
ئین وقت کی روٹی اور بیٹی کی تعلیم کے اخراجات پورے کرتی تھی۔ ان  
حالات کے پیش نظر بوبی نے کہا۔

"دھید بھجھے ہمیشہ کے لئے زینالو — میں ابڑھی ماں پر کہا تک بوجھو  
بنی رہوں گی — شادی کے بعد تم چاہو گے تو میں (پنی) تعلیم چاری رکھوں  
گی — !"

دھید کے سر پر اپنی بہن انجمن کی ذمہ دل ریاں تھیں۔ اس نے کہا۔  
"تم جانتی ہو کہ میں انجمن کو ڈاکٹر نہانہ چاہتا ہوں۔"  
"تم اس کی شادی کرو — وہ بھی سرال میں جا کر پڑھ لے جی۔"  
"شادی کے بعد تعلیم کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ — لیکن  
آصف دولمنہ بھی ہے اور ذہین بھی — وہ انجمن کو شادی کے بعد  
پڑھا سکتا ہے۔"

"کیا شادی کی جملت طے ہو گئی ہے۔ ?"  
"ابھی طے نہیں ہوتی — لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے  
ہیں۔ اب آصف باقاعدہ انجمن کا رشتہ مانگنے پرے پاس آئے  
تو ہات بنے گی۔ !"  
جو بی نے کہا۔

"یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں کہ لڑکا یا لڑکے دالے رشتہ مانگنے  
لڑکی کے گھر آیا کرتے تھے — یہ نیادر ہے۔ انجمن کو خود آصف سے  
شادی کی بات چھپڑنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ بے شرمی ہے۔ میری بہن ایسا نہیں سمجھ سکتی:  
ہم اپنی شادی کی باتیں کر رہے ہیں۔ کیا یہ بے شرمی نہیں ہے۔ ?"

"ہماری بات دوسری ہے۔"

"ہاں میں دوسری ہوں۔ میری جگہ تمہاری بہن الیسی باتیں مگر توبہ شرمی ہے اور میں کروں تو وہ عشق کھلا نہیں چکا۔"

"بھتی، تم تو سمجھ کرنے لگیں۔"

"تم تسلیم کرو کہ میں درست کہہ رہی ہوں۔ پھر میں تمہاری مشکل آسان کر دوں۔"

"تم درست کہہ رہی ہو۔ چلو اب مشکل آسان کرو۔"  
"مجھے آصف کا پیغمبر نبادت ہے۔ میں اس سے انجمن کے رشتے کی بات کروں گی۔"

"تم کس رشتے سے انجمن کے رشتے کی بات کرو گی۔؟"  
"دادی آماں بن کر جاؤں گی۔ کہوں جی میاں صاحبزادے! میں انجمن کی دادی ہوں، دبئی سے آئی ہوں۔ اگر تم دو دن کماند اس سے نکاح نہیں پڑھواؤ گے تو میں اس سے یہ کہ دبئی پلی جاؤں گی۔"  
"دو بوقتی عورت کی لرزتی ہوتی آواز میں مرکاٹے اور اکر رہی تھی۔  
وحید نہس رہا تھا۔"

اکصف نے ہستے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تم انجمن کے رشتے کی بات کرنے آئی ہو۔؟"

"جی ہاں۔! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟" بوبی نے پوچھا۔

"بارکل نہیں۔ میں پہلے تو یہ معلوم کرنا چاہیں گا کہ تم انجمن کی کون ہو۔؟"

"سہیلی۔!" بوبی نے جواب دیا۔

"اوی ہونہہ۔ میں نہیں مانتا کہ تم اس کی سہیلی ہو۔ تم نے اپنا نام بابرا تباہی لی ہے اور انجمن کی کسی سہیلی کا نام بابرا نہیں ہے۔"

"دھ مچھے بوبی کہتی ہے۔"

"بوبی۔؟" آصف نے چونک کسل سے دیکھا۔ "اچھا تو تم انجمن کی ہونے والی سمجھا بی ہو۔؟"

پوپی نے شرما کر گردان تجھکالی۔ آصف نے کہا۔

”تعجب ہے! تم یہاں میری شادی کی بات کرنے آئی ہو اور اپنی شادی کے ذکر پر شرما رہی ہو۔“

دہ سکرانے لگی۔ پھر اس نے کہا۔

”اگر آپ انہم سے دافعی محبت کرتے ہیں تو پھر آپ کو جلد ہی شادی کی بات کرنا چاہئے۔“

”میں انہم سے محبت نہیں کرتا۔ ہاں اسے پسند کرنا ہو۔“

”یہ کیا بات ہوتی؟ آپ محبت کرتے ہیں اسی لئے تو پسند کرتے

ہیں نا۔؟“

”بھتی پسند تو بہت سے لوگ آتے ہیں۔ تم بھی مجھے لپسند آئی ہو۔“

”جی۔؟“ دہ چرانی سے بوجو۔

”جی ہاں۔ دنیا کی ہر خوبصورتی پسند آتی ہے۔ کسی کو پسند کرنے کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں محبت کرنے کے لئے سو جھو بوجھو اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ حوصلہ نہ تو انہم میں ہے، نہ وحید میں۔۔۔۔۔“

”آپ وحید کی توہین کر رہے ہیں۔؟“

”جب تم رشتے کی بات کرنے آئی ہو تو تمہیں بڑا نہیں ماننا چاہئے کیونکہ میں ہونے والے رشتہوں میں جوا چھائی یا بڑائی دیکھوں گا، دہی کھوں گا۔“

”آپ نے کیا دیکھا ہے؟“

”یہی کہ دجید صاحب دلختنہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ایک چھا صاحب نے انہیں آفردی ہے کہ اگر وہ گھر داماد بن جائیں، تو انہیں کم از کم ایک لاکھ روپے کار دبار کے لئے دیئے جائیں گے۔ اور انہیں کو تقلیم دلانے کے لئے ملک سے باہر بھیجا جائیں گا۔“

”کیا آپ مجھے دجید کے خلاف پہکار ہے ہیں؟“

”نہیں۔ تم رشتے کی بات کرنے آئی ہواں لئے جواباً کہہ رہا ہوں گے میں نے انہیں سے شادی کے لئے کہا تھا۔ لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال رہی ہے کہ وہ بہت بڑی ڈاکٹر بننے کے بعد شادی کرے گی۔ میں تین سال تک اس کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میں تنہا ہوں اور مجھے ایک شرپ کی حیات کی ضرورت ہے۔“

”آپ صرف اپنی ضرورت دیکھ رہے ہیں۔ کیا انہیں ڈاکٹر بننے کی توانا کو فخر حاصل نہیں ہو گا؟“

”وہ فخر تین سال بعد حاصل ہو گا۔ پھر تم ابھی رشتے کی بات کیوں کرو رہی ہو؟“

”ایں...“ ”وہ گزر بڑا گئی۔ کیونکہ انہیں کی شادی کے بعد ہی جب اسے اپنی دلہن بناسکتا تھا۔

”بوی! انہیں مجھے اور دجید تمہیں ٹال رہا ہے۔ ہم دونوں شادی کے خواب ہی دیکھتے رہ جائیں گے۔“

دہنارا نشگی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔  
”مجھے دحید پر بھروسہ ہے۔“

”میری دعا ہے کہ تمہارے بھروسے کی لاج رہے۔ دیسے میری بات درست ہو اور تمہارا دل ٹوٹ جائے تو مجھ سے ایک بار خود ملنا یہیں اپنی زندگی کا ایک یادگار مشورہ دوں گا۔“

”وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔ یعنی اس گھر سے منہ پھر کر گئی۔ جہاں اسے ایک دن دلہن بن کر آنا تھا۔ اس روز اٹھتے بیٹھتے آصفیکی باتیں اس کے دماغ میں گوئختی رہیں کہ کونی اس کا دو لتمند چچا اسے اپنا گھر دا ماد بنا ناچاہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دحید خود بھی دولتمند بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس بات کا وہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔ دہ شام کو دحید سے ملنے کی تو انجمن نے کہا۔

”بھائی جان ابھی آئے تھے۔ پھر چچا جان کے ہاں چلے گئے۔

”انجمن! ایک بات پوچھوں؟“

”ایک نہیں، مہرار باتیں پوچھو۔“

”کیا تمہارے چچا بہت دولتمند ہیں؟“

”ہاں۔“ دہ خوش ہو گرلو لی۔ اتنے دولتمند ہیں کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن پہنچنے والے ہیں۔“

”سنا ہے کہ وہ تمہارے بھائی جان کو اپنے دا ماد بنانے والے ہیں۔“

انجمن کے مکاراتے ہوئے چھرے کا زنگ بدال گیا۔ وہ ناگواری

سے بولی۔

”یہ جھوٹ ہے۔“

”ایک بار تم نے کہا تھا کہ آصف ایک اعلیٰ کردار کا مالک ہے۔  
وہ کبھی جھوٹ نہیں بوتا۔“

”اچھا تو آصف نے تمہیں بہکایا ہے۔“

”اگر یہ جھوٹ ہے تو یقیناً اس نے بہکایا ہے۔ اور وہ اعلیٰ کردار  
کا مالک نہیں ہے۔“

”تم آصف کی توبین کر رہی ہو۔ میں یہ برداشت نہیں کر دیں گی：“

”تو پھر تسلیم کرو کہ آصف نے پس کھا ہے：“

”نہیں کھا ہے۔“

”تو پھر وہ جھوٹا ہے：“

”نہیں ہے۔“

بوی اسے گہری ٹھُٹتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوتی بولی۔

”میں عورت ہوں، تمہاری مجبوریوں کو سمجھے گئی ہوں۔ تم اپنے محبوب  
کی حمایت نہیں کر سکتیں اور بھائی کی خلافت میں بول نہیں سکتیں۔ میں  
خود ہی تمہارے بھائی سے پوچھ لوں گی۔“

دہ بو محفل قدموں سے لوٹ گئی۔ وجید پر جو بھروسہ تھا، اس بھروسہ  
کا زنجیر ٹوٹ رہی تھی۔ انجمن کے گول مول سے جوابات نے یقین دلادیا  
تھا کہ جس طرح دال میں کچھ کالا ہوتا ہے، اسی طرح وجید کے دل میں

بھی کچھ کالا ہے۔

دوسرے دن وہ بھروسہ کے مکان پر اس سے ملنے گئی تو وہاں دروازے پر نالا پڑا ہوا تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ دونوں بھائی بہن مکان خالی تر سے کہیں چلے گئے ہیں۔

بوبی نے لوچا۔

کہاں گئے ہیں۔؟

”پتہ نہیں جی۔ ان کے کوئی چھاپا ہیں، گلبرگ میں بہت بڑی کوئی ہے مگر میں پتہ نہیں جانتا۔“  
وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح ڈوبتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔



وہ ایک باغیچے میں رنگ برنسگے چپولوں کے درمیان بیٹھی ہوتی تھی کہ آصف کی آداز سناتی دی۔

”مہیلو بوبی !“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آصف نے پوچھا۔

”کیا میرے پسح اور جھوٹ کا پتہ چل گیا۔؟“

وہ انٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ابھی نہیں۔!“

وہ بولا۔

”تھہارا تحکما ہوا ہجھ، اڑی ہون رنگت اور جملک ہوتی نظریں تبارہی ہیں کہ تم سچائی کو چھپا رہی ہو۔“

وہ سر جھکا کر جانے لگی، آصف نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”اگر ساتھ چلتے چلتے کسی کا ساتھ چھوٹ جائے تو اس کا مطلب  
یہ نہیں ہوتا کہ سفر ختم ہو گیا۔ نہیں بوی! آگے بڑھنے کے لئے پہلے  
سے بہتر ہم سفر مل جاتے ہیں۔“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”یہی کہ انجمن نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔“

”وہ اب بھی آپ سے محبت کرتی ہے۔“

”ہاں — محبت کرتی ہے۔ شادی نہیں کرتی۔ پہلے ڈاکٹر بننا  
چاہتی ہے۔ ایک بیمار کو الجھی دوا کی ضرورت ہے۔ اور وہ تین سال بعد  
دوا دینا چاہتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ بیمار زندہ کیسے رہے گا؟“

”اگر آپ کے دل میں اس کی محبت ہوگی تو ساری عمر اس کا انتظا  
کریں گے۔“

”یہ محبت نہیں حاصل ہوگی۔ شادی سے پہلے جو محبت ہوتی ہے  
وہ دراصل محبت نہیں ہوتی۔ محبت کی ریہرسی ہوتی ہے۔ اس ریہرسی  
کے ذریعہ ایک دوسرے کی اچھائی اور بُراقی کو سمجھنے کا سلیقہ آتا ہے۔“

”آپ نے کیا سلیقہ سیکھا ہے؟“

”یہی کہ جو محبت کی پہلی منزل میں ساتھ چھوڑ دے۔ وہ ہم سفر آڑی  
منزل تک کبھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے یہی سلیقہ سیکھا ہے  
کہ آدمی جانوں کی طرح اکیلانہیں رہ سکتا۔ اسے جینے کے لئے ایک ساتھی  
کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری دنیا بہت خوبصورت ہے بوی!“

ایک کا ساتھ چھوٹ جاتے تو ہم دوسرا ہیں ساتھی تلاش کر سکتے

ہیں۔ ”  
بوپی کے ہُن پر آصف کی نظر میں جنم گئی تھیں۔ وہ پہچاناتی ہوئی  
جانے لگی اس نے کہا۔

”اگر تم اب بھی دھید کو تلاش کر رہی ہو تو میں تمہیں اس کے  
پاس پہنچا سکتا ہوں۔“

بوپی نے یوں چونکا کر اسے دیکھا جیسے منزل تک پہنچنے کا راستہ  
آسان ہو گیا ہے۔



نائٹ کلب کے ماحول میں بڑی رنگینی تھی۔ مختلف میزوں کے اطراف نوجوان جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ آرکسٹر کی دھمی دھمی آواز دلوں میں اتر رہی تھی۔ بوبی اور آصف، ایک میز کے اطراف بیٹھے ہوتے تھے۔ آصف نے بوبی سے کہا۔

”ادھر دیکھو۔“ وجید صاحب تشریف لارہے ہیں۔“  
بوبی نے سرگھا کر دیکھا پھر ایک دم سے مایوس ہو گئی وہ یقیناً وجید نہا۔ مگر اس کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔ اس نے پہترین سوٹ پہنچا ہوا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک جوان لڑکی کا ہاتھ تھا۔ لڑکی کا لباس اور زیورات بتا رہے تھے کہ وہ کوئی ریس زادی ہے۔ کلب کے بہت سے لوگ اسی ریس زادی کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ وجید بھی ان لوگوں سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اچاک اسی کی نظر میں بوبی پر پڑی۔

وہ ایک دم سے گھبرا گیا۔ پریشان ہو کر رئیس زادی کو دیکھنے لگا۔  
شاپد وہ نہیں چاہتا تھا کہ رئیس زادی بوبی کو دیکھے۔ یا ان کے  
تعلقات کو سمجھو سکے۔

اس نے رئیس زادی سے کہا۔

”ٹھینہ! میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔ صرف ایک  
منٹ میں.....“

ٹھینہ مسکرا کر دوسروں سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے سر ہلا کر اسے  
جانے کی اجازت دے دی۔ دہ تیزی سے چلتا ہوا بوبی اور آصف  
کی طرف آیا۔ پھر ہچکچا تے ہوئے بولا۔

”بوبی! تم یہاں کیسے آگئیں؟“

بوبی کم خصم اسے دیکھ رہی تھی۔ آصف نے کہا۔

”وجید! تم پریشان نظر آرہے ہو، بیٹھ جاؤ۔“

وجید نے پلٹ کر دوڑ ٹھینہ کی جانب دیکھا۔ پھر بیٹھتے ہوئے  
کہا۔

”بوبی! میں سمجھو رہا ہوں کہ تم ناراض ہو، مگر میں، میں بہت مجبو  
ہو گیا ہوں۔ تم جائز ہو کر میں اپنی بہن کو کتنا چاہتا ہوں۔ اسے اعلیٰ  
تعلیم دلانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کی خاطر اپنی محبت کا گلا گھونٹ  
رہا ہوں۔“

آصف نے کہا۔

”بہت اچھے ڈائیلک ہیں۔ لیکن انہیں کے تعلیمی اخراجات میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہا، تم نے انکار کیوں کر دیا؟“  
و حیدر نے ناگواری سے کہا۔

”کوئی غیرت مند بھائی اپنی بیٹی کے ہونے والے شوہر کا احسان نہیں لیتا۔!“

”شادی کے بعد تو احسان نہ ہوتا۔ اپنی بیوی کی تعلیمیں مکمل کرانا میرا فرض ہوتا۔“

”شادی کے بعد لڑکیاں گھر گستاخی میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ انہیں پہلے ڈاکٹر بننے کی پھر شادی کرے گی۔“  
بوبی نے پوچھا۔

”کیا تمہاری دوستی بیوی اس سے ڈاکٹر بنانے کی۔؟“

”آں، تم۔ تم طعنہ دے رہی ہو۔“

”ایک غریب لڑکی اندکیا دے سکتی ہے۔ آج معلوم ہوا کہ غرب او زردا دہ غریب اس لئے ہو جاتے ہیں کہ انہیں ان کے حصے کی محبت بھی نہیں ملتی۔!“

”بوبی! میں آج بھی تم سے اسی طرح محبت کرتا ہوں۔“

”بکو اس مت کرو۔ اب آصف، صاحب کی باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں کہ تم سب شادی سے پہلے محبت نہیں حاصل کرتے ہیں۔ مردادر خورت کی دوستی وہی بہتر ہوتی ہے، جو شادی کے بعد ہوتی ہے۔“

اس کی بات پوری ہوتے ہی تہنیہ کی آواز آئی۔ وہ دحید کو آواز دیتی ہوئی آرہی تھی۔ دحید فوراً ہی تہنیہ کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”سوری تہنیہ مجھے فدا پیر ہو گئی۔ میں ابھی آنے ہی والا تھا۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔“ تہنیہ نے بوبی کو دیکھنے ہوئے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری کسی لڑکی سے دوستی نہیں ہے۔“  
 دحید نے ہپکھپاتے ہوئے بوبی کو دیکھا۔ پھر جلدی سے بولا۔  
 ”آل۔ ہاں، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میری ان سے دوستی نہیں ہے۔“

”تو پھران کی تعریف؟“

”یہ میرے دوست آصف ہیں اردویہ..... آصف صاحب کی والٹ ہیں.....“

بوبی کے ذہن کو ایک جھٹکا سالگا۔ والٹ۔ بھوی۔ آصف کی شرکی حیات۔ آصف کی محبت.... وہ چوک کر آصف کو دیکھنے لگی۔ زہ بھی مسکرا کر لے دیکھ رہا تھا۔ آرکشا کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ ایسیچ پر مرد عورتیں ملی جلی آواز میں گار ہے تھے۔

”چھوڑو، چھوڑو، اپناروں نہ توڑو۔“ کوئی تمہیں ٹھکرائے تم۔ ٹھکراؤ۔ اتنے بڑے جہان میں اپنا جہاں بساو۔ چھوڑو، چھوڑو۔ اسے چھوڑو، چھوڑو۔“

بوبی ایک دم سے بکھر گئی تھی۔۔۔ وہ بے شاشه دہاں سے بجا گئی  
چلی گئی۔۔۔ کلب سے باہر آ کر آصف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ٹھہر د۔۔۔ میں نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری سچائی ثابت ہو جائے تو ایک بار تم میرے گھر آؤ گی۔۔۔ پھر میں دہاں تھیں ایک اہم مشورہ دوں گا، ایک یاد گار مشورہ.....“

”مجھے کسی کا مشورہ نہیں چاہئے۔۔۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔

— مجھے جانے دو۔۔۔“

”تو پھر مرلنے سے پہلے میری نیکیوں کا بد لرجھ کارو۔۔۔ آؤ۔۔۔ خندن کرو۔۔۔“  
وہ اسکو ٹرپر بیٹھو گیا۔۔۔ بوبی لے سے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھو  
رہی تھی۔۔۔ آصف نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ پیچھے بیٹھو گئی۔۔۔ پہلے وہ  
الگ بیٹھی ہوتی تھی، اسکو ٹراپ جمعنے سے اسٹارٹ ہوا تو وہ آصف سے  
مٹک رہ گئی۔۔۔ پھر جلدی سے الگ ہو گئی۔۔۔ گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دردی  
جاتی تھی۔۔۔ بوبی کی نکاحوں کے سامنے آصف کی پہاڑ جیسی لپٹت تھی  
خالف سمت سے آنے والی گاڑیوں کی سیڈ لا ٹیپس سے آنکھیں چندھیا  
جائیں تو وہ سہارے کرنے اپنا ہاتھ آصف کے شانے کی طرف بڑھا  
 دیتی۔۔۔ پھر پچکچا کر شانے تک ہاتھ پہنچنے سے پہلے ہٹا لیتی۔

راستے کا موڑ ہو یا زندگی کا، ہر موڑ پر سنبھلنے کے لئے سہارے کی  
ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ آصف نے ایک موڑ پر اسکو ٹرکو تیزی سے موڑا  
تواتھرا دھر سے گزرنے والی گاڑیوں کی پیچے پکارا درسیڈ لا ٹیپس کی روپیں

سے گھر اکروہ بے اختیار آصف کی پشت سے لپٹ گئی۔

پھر اسے پتہ چلا کہ ٹرینیک کا طوفان کیسے گزر گیا؟ اور وہ کتنی دیر آصف کی پشت سے لگی رہی۔ اسکو ٹرکے ڈکنے ہی اسے سوچ آیا، تو وہ فوراً ہی الگ ہو کر گاڑی سے اتر گئی۔ اسی کی نظریں جھکی ہوتی تھیں۔ دل دھڑک رہا تھا۔ آصف کی آداز کاںوں میں آئی۔

"بوبی! لگبڑا تو نہیں۔ میں شریف آدمی ہوں۔ تمہیں بھری نات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میرے ساتھ ماؤ۔"

وہ سر جھکتا۔ مکان میں داخل ہوئی۔ ڈرائیور میں پہنچ کر دھٹک کر گئی۔ صنوں کے درمیان ایک میز پر ایک راتفل، ایک ریوالر، اور مختلف قسم کے چاقو چھڑے رکھے ہوئے تھے۔ جھٹپٹ پر پہنچے کی جگہ پھانسی کا ایک سچندا لٹک رہا تھا۔ میز پر اونکتی ہی شیشیاں رکھی ہیں تھیں جن پر مختلف قسم کے زبر کے لیبل چپاں تھے۔ بوبی نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ...۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟"

آصف نے جواب دیا۔

"خودکشی کا سامان ہے۔ آج تک محبت میں ناکام ہونے والوں نے جتنے طریقے اور جتنے سوچیا رہوں سے خودکشی کی ہے، وہ سب بیان موجود ہیں۔ اتفاق سے ہم دونوں محبت میں ناکام ہو چکے ہیں۔"

بوبی نے ہو چکا۔

”کیا آپ بھی مزاحا ہتے ہیں؟“

”نہیں۔ مجھے تمہارے روپ میں ایک نئی زندگی میں سکتی ہے۔ اس لئے مرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہیں اعتماد نہ ہو کہ میں تمہیں بلے لوٹ محبت اور زندہ رہنے کا حوصلہ دے سکتا ہوں۔ تو خود کشی کرو۔“

بوبی نے ایک خبر کی طرف دیکھا۔ آسف نے اس خبر کو اٹھا کر کھما۔

”میں سوچتا ہوں کہ یہ خبر سینے میں انارلوں توموت گلے لے گی۔“  
بوبی نے چشم تھوڑے میں دیکھا۔ آصف کی لاش ایک صوفہ پر پڑی ہوتی ہے اور وہی خبر اس کے سینے میں پیوست ہے۔ آصف کی آداز آئی۔

”اگر اس سینے پر تمہاری محبت ہو تو مجھے زندگی ملے گی؛  
اب کی بار تھوڑے میں صوفہ پر بیٹھا ہوا آصف زندگی نظر آیا۔  
کیونکہ جہاں خبر تھا اب اسی جگہ سینے پر بوبی نے اپنا سر کھدیا  
تھا۔ اس نے کسی کو زندگی دے دی تھی۔“

آصف نے روپ والوں کا لٹھا کر کھما۔

”محبت سے زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔ نفرت میں مر جانا  
نہایت آسان ہے۔ تم نہایت آسانی سے اس کی نال کپٹی پہر  
رکھ کر خود کشی کر سکتی ہو۔“

بوبی نے دیکھا — وہ ریوالور کو اپنی کپٹی پر لکھ کر ٹریکر کو دباری تھی — ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اس کے دیدے پھیل گئے۔ اس کا چہرہ مژدہ ہو گیا — منظر بدل گیا — اس نے دیکھا کہ وہ پھولوں کی انجمیں میں مشکرا رہی ہے۔ جہاں اس نے ریوالور کر گولی چلاتی تھی۔ دہیں سیاہ بالوں میں آصف پھول ٹانک رہا تھا اور کہہ رہا تھا — ”جس سر میں موت کا سودا سما تا ہے اسی سر میں زندہ رہنے کی آزندہ پھول کی طرح کھلتی ہے....“ زندگی بے حد حسین نظر آ رہی تھی۔ بوبی کے جذبے گنگنا رہے تھے۔

آصف نے پوچھا۔

”کیا سوچ چ رہی ہو۔؟“  
وہ چونک کر بولی۔

”آں، آپ مجھے موت سے ڈار ہے ہیں۔“

”نہیں — یہ بتا رہا ہوں کہ زندگی کتنی حسین ہے۔ ایک بے دنا کی خاطر اسے فنا نہیں کرنا چاہیئے۔“

”میں ایک کے بعد دوسرا سٹھو کر نہیں کھانا چاہتی۔۔۔“

”جو گر کر سنبھالنا یکھ لیں وہ دوبارہ سٹھو کر نہیں کہاتے۔۔۔“

”میں اب کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔۔۔“

”میں بھروسے کی نہیں۔۔۔ زندہ رہنے کی بات کر رہا ہوں — زندہ رہنے کا ایک سخت یہ ہے کہ کسی سے کچھ پانے کی توقع نہ کرو۔۔۔ اپنے

پاس محبت کے جو خزانے ہیں لٹاتی رہو، کوئی قدر داں ملے گا؟  
وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ آصف نے کہا۔

”میں نے بھی تمہاری طرح زخم کھانے ہیں۔ میں صرف تمہیں  
پانے کی آرزو میں زندہ ہوں ورنہ کہوتا اس پہانشی کے پھنڈے کو  
گلے سے لگاؤں۔؟“

بوی نے دیکھا۔ دہ صوفول کی درمیانی میز پر چڑھ کر پھنڈے  
کو اپنے گلے میں ڈال رہا تھا۔ دوسرا منظر یہ تھا کہ بوی آصف  
کے پیچے کھڑی ہوئی تھی اور بڑے پیار سے اپنی بائیوں کا چندنا اس  
کے گلے میں ڈالے اس پر حملکی ہوتی تھی۔ ایک بار پلک چھپکنے  
سے آصف کی گردن میں پہانشی کا چندان نظر آتا تھا۔ دوسرا بار  
پلک چھپکنے سے آصف اس کی بائیوں کے پھنڈے میں مسکراتا تھا۔  
سپر اچانک آصف نے درمیانی میز کو ٹھوکر مار کر گرا دیا۔  
خودکشی کا عمل پورا ہو گیا۔ پہانشی کے پھنڈے نے آصف کی گردن  
جکڑی۔ مژدہ جسم جھولنے لگا۔ بوی یکبارگی چیخ مارتی ہوئی  
دوڑتی ہوتی آئی اور اس کے گلے میں بائیوں کا چندان ڈال کر لپٹ  
گئی۔!

”نہیں۔ میں آپ کو مر نے نہیں دوں گی۔ میں زندہ  
رہوں گی.....“

آصف نے مسکرا کر کہا۔

"میں نہیں — ہم زندہ رہیں گے۔"

بوبی نے بھیگی آنکھوں سے دیکھوا۔ وہ زندہ تھا۔ مگر اربا  
تھا۔ اس کے آنسو پونچو رہا تھا۔ اس نے اپنا سر اس کے کشادہ  
سینے پر رکھ دیا۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ کانوں میں شہنازیاں  
نکر رہی تھیں۔ موت میں گئی تھی۔ نئی زندگی کے نئے راستے پر آتش  
بازیوں کے جگہ گاتے ہوئے رنگ بکھر رہے تھے۔

ہسپتال کا وہی کمرہ تھا۔ وجید کے سامنے بوبی ایک کرسی پر بیٹھی  
اس تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ یوں کہنا چاہیے تصویر کے پیچھے ماضی کو  
دیکھ رہی تھی۔!

وجید نے کہا۔

"تم شاید یہ سوچ رہی ہو کہ میں اس تھویر کے ذریعے تمہیں بلیک  
میل کروں گا۔ لیکن میں ایسا کم طرف نہیں ہوں۔"

"تم کیا ہو۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ تصویر کے  
ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہوئی بولی۔ "آصف اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں گناہکا  
نہیں ہوں۔!"

اس نے تصویر کے ٹکڑے وجید کے منہ پر چینک دینے۔ وہ  
سنجیدگی سے بولا۔

"بیشک تم گناہ کار نہیں ہو۔ میں پہلے بھی تمہاری عزت کرتا  
تھا۔ اب بھی تمہاری عزت کرتا ہوں۔ یہ میری بھول تھی کہ میں نے اب تک

تھماری تصویر کو سینے سے لگائے رکھا ہے۔ چلو اچھا ہوا تم نے اس کے  
لکڑے کر دیئے۔ اب خفہ تھوک دو۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تم سے خوش ہونے یا ناراض ہونے والا  
کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

"بوبی! میں نے تم سے فریب کیا اس کی سزا مجھے مل گئی ہے۔ تم نے  
نے طلاق لے کر محبوسے ناطہ توڑ لیا ہے۔ چھا جان نے مجھے گھر سے نکال  
دیا ہے۔ اگر انہیں ڈاکٹر بن کر یہاں نہ آتی تو ہمارا کہیں سکانا نہ ہوتا  
اس کی کوششوں سے میں نے ہسپتال کے احاطے میں دراؤں کی  
ایک دکان کھول لی ہے۔"

"تمہاری بہن تو تمہارے لئے جان بھی دے سکتی ہے۔ کیونکہ  
تم نے اس کی خاطرا ایک بزریب کو دھوکہ دیا۔ اور ایک امیرزادی سے  
شادی کی تھی۔"

"مجھے شرمende نہ کرو بوبی! یہ بتاؤ! آصف کے ساتھ کیسے گور،  
رہی ہے؟"

"یہاں گئے ہی شدّاد آئے مگر جنت نہ بنا سکے۔ کیونکہ صرف  
آصف جیسے شوہر ہی ہماری دنیا کو جنت بنا سکتے ہیں۔ ہمارا  
گھر بہت خوبصورت ہے۔ وہ ایک مدرسہ ہے۔ جو نوجوان شادی  
سے پہلے محبت کرتے ہیں ہم انہیں اپنے ہاں بلا کر سمجھاتے ہیں، ہبیق  
پڑھلتے ہیں کہ کسی نلگی کا آنچل میلانہ کرو۔ اسے راہ چلتے نہ چھیرو،

آپ میں سمجھو تو کرو۔ اگر وہ تمہاری محبت کا جواب محبت سے دے تو  
تم اسے کبھی دھوکہ نہ دو۔"

دوسرے کمرے میں بیہقی ہریٰ انجمن نے آصف سے کہا۔

"تمہارا گھر تو بہت ہی اچھا مدرسہ ہے۔ کیا مجھے اپنے گھر نہیں بلاد  
گے؟"

"میرے گھر کے دددازے تمہارے لئے کھلے ہیں۔"

"بوبی برا تو تمہیں مانے گی؟"

دوسرے کمرے میں بوبی نے کہا۔

"آصف تنگ نظر نہیں ہیں کہ برا مان جائیں۔ لیکن میں نہیں  
چاہتی کہ آئندہ تم مجھ سے ملو۔"

"بوبی! میں نے جو غلطی کی ہے۔ اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔

میری زندگی کا اب ایک ہی مقصد ہے کہ میں تمہارے اور آصف کے  
کسی کام آتا رہوں۔"

بوبی نے اسے گھری نظر دی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنے سخیدہ اور شریف ہو گئے ہو۔"

"تم مجھے تھوڑا سا موقر دو۔ میں اپنی شرافت کا ثبوت ہر دہ پیش  
کروں گا۔ ارسے ہاں۔ بیر تو پہ چھاہی بھول گیا۔ ان تین برسوں میں  
کوئی نئھا منا گو دیں آیا ہے یا نہیں؟"

وہ اچانک اراس ہو گئی۔ وحید نے اسے خود سے دیکھتے ہوئے

کہا۔

"اچھا سمجھو گیا۔ انہم بہت ہی قابل ڈاکٹر ہے۔ تم معاشرہ کرا سکتی ہو۔"

دوسرے کمرے میں آصف نے کہا۔  
"معاشرہ ہو چکا ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹرنے کہلے ہے کہ وہ ماں بن سکتی ہے۔"

انہم نے کہا۔

"تو پھر تمہیر اپنا چیک اپ کرانا چاہئے۔ چلو میں تمہیں ڈاکٹر زیدی سے ملاقاتی ہوں۔"

"نہیں انہم! اسہاری ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار ہے۔ خدا نخواستہ ڈاکٹرنے یہ کہہ دیا کہ میں باپ نہیں بن سکتا تو بوبی کی رہی سہی امید بھی ختم ہو جائے گی۔"

"یعنی تم دونوں خود کو دھوکہ دے رہے ہو۔ یہ داشمندی نہیں ہے۔"

"ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی خوبیوں اور خامیوں کا عالم ہونا چاہئے۔ لیکن میں بوبی کو....."

"تم بوبی کو نہ بتاؤ۔ چپ چاپ ڈاکٹر زیدی سے کنسٹٹ کرو۔ اگر معاشرہ کے بعد بوبی سے چھپانے والی بات ہو تو اس سے چھپائے لکھا۔ وہ اپنی امیدوں کے سہارے بہلتی رہے گی۔ چلو انھوں دیر نہ کرو۔"

آصف گھری سنجیدگ سے سوچنے لگا۔ انہم اپنی جگ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔  
”جو لوگ اپنی خامیوں کا حساب نہیں رکھتے۔ دوسرے لوگ ان خامیوں سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔“

آصف اسے سوالیہ نظر وں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔  
”اگر تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ تمہارے گھر میں کوئی چور دروازہ بھی ہے۔ تو کوئی بھی اپنے گھر کا چڑا اس چور دروازے کے راستے تمہارے گھر میں پھینک کر جا سکتا ہے۔ چلو انھوں باؤ۔“  
اس نے آصف کا ہاتھ تھام لیا۔ دوسرے کمرے میں دھید نے کہا۔

”بوبی! تم بہت معصوم ہو۔ تمہیں اپنی بھلانی کے لئے آصف کا معاونہ کرنا چاہیئے۔“ دیکھو بعض عورت باخود نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وہ عرصتہ دداز تک ماں نہیں بن سکتی۔ مرد قدرت کی رضی نہیں دیکھتا وہ اولاد کے لئے دوسری شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔“  
”آصف کبھی دوسری شادی نہیں کریں گے۔“

”خدا کرے کہ تمہارا اعتناد فاتح رہے۔“ مگر یہ خون کے رشتے بڑے اہم ہوتے ہیں۔ ان کے لئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میں نے بہن کی خاطر نہ سے بے وفا قیکی۔ آصف زندگی کے کسی موڑ پر اولاد کی خاطر دوسری شادی کے لئے سوچ سکتا ہے۔“

”تم نے ملتے ہیں مجھے بہ کافی شروع کر دیا۔“

”نہیں بولی! تم مجھے دشمن سمجھو تو مگر میں دعست بن کر سمجھا رہا ہوں۔ اگر آصف کے معاشرے سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ باپ بن سکتا ہے تو تم اسی کے بچے کی ماں بنو گی۔ اور اگر معاشرہ کا نتیجہ یہ سلاکر وہ باپ نہیں بن سکتا تو پھر وہ دوسری شادی کے متعلق کبھی نہیں سوچے گا۔ اس کا معاشرہ ہر حال میں تمہارے لئے مفید ثابت ہو گا۔“  
وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہارے مشوروں کا شکریہ۔ میں آصف کی بیوی ہوں۔ اور آصف سے مشروہ لئے بغیر تمہارا مشورہ قبول نہیں کر سکتی۔“  
اس نے جانے کے لئے دروازے کا رخ کیا۔ پھر ٹھہک گئی۔  
دروازے پر آصف اور انہیں کھڑے نہیں۔ وجہ نے چونکہ کہ آصف کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر مسافم کرتے ہوئے بولا۔

”ہیلو آصف! میں تو بولی کو سمجھا رہا تھا کہ... . . .“  
”میں نے سن لیا ہے۔“ آصف نے کہا۔ ”انہیں بھی مجھے تمہاری طرح سمجھا رہی تھی۔ اپنی بہن سے پوچھو۔ میں نے بھی بھی جواب دیا تھا کہ بولی کے مشورے کے بغیر میں میں اکٹر زیری سے کنسٹرکٹ نہیں کروں گا۔“

بولی نے خوش ہو کر بولی کا بازو تھام لیا۔ وجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بھئی! سنا تھا کہ محبت میں دل ملتے ہیں۔ تم دونوں کے تودمانے بھی ملتے ہیں۔ دونوں ایک ائم طرح سے سوچتے ہیں۔“  
انجمن نے کہا۔

”ہاؤ ایور کیا میں نے اور بھائی جان نے غلط مشورہ دیا ہے؟“  
آصف نے کہا۔

”تم دونوں نے دوستانہ مشورہ دیا ہے۔— تم کیا کہتی ہو جو بی؟“  
بوبی نے جواب دیا۔

”دوستوں کے مشورے میں خلوص اور سچائی ہوتوا سے قبول کر لینا چاہئے۔“  
انتہے میں ڈاکٹر زیدی والپس آگئے۔ انہوں نے انجمن سے کہا۔

”ہیلو ڈاکٹر! تمہارے ساتھو بڑی بھیڑ ہے۔ خیریت تو ہے؟“  
وہ بولی۔

”جی ہاں خیریت ہی ہے۔“ اس نے بوبی اور وحید سے کہا۔ ”آپ لوگ ذرا باہر جائیں پہنچ دنٹ مانند...“  
بوبی نے آصف کو دیکھا۔ آصف نے اس کے شلانے کو تھیک کر کر کہا۔

”جاوے میں الجھی آتا ہوں۔“  
وہ وحید کے ساتھ باہر چلی گئی۔  
کہا۔

بیڈ دھم میں زیر پادر کے بلب کی مٹی مٹی سی روشنی تھی۔ نوم  
کے بیڈ پر آصف اور بوبی لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں کی نظریں چھت  
پر جمی ہوتی تھیں۔ دونوں ہی سوچ میں گھم تھے۔ پھر بوبی نے ایک  
جگہی سانس لیکر کہا۔  
 ”صبع نہیں ہو رہی ہے۔“  
 آصف نے کہا۔

”ہاں۔ صبع ہو جائے گی تو پھر شام ہونے میں دیر ہو جائے گی۔“  
 ”آپ کو ڈاکٹر سے کہنا چاہئے تھا کہ وہ صبع ہی میں خوشخبری سنادی۔“  
 ”خوشخبری۔“ آصف نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ پھر جلدی سے  
 بولا۔ ”اگر ڈاکٹر مجھے باپ بننے کی خوشخبری سنادی۔ تو یہ ہم دونوں  
 کے لئے خوشخبری ہو گی۔“

”آصف! آپ سچ نہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر سعیں مایوس نہ کرے۔ تمہاری مختاری کے ارادا پورے ہو جائیں۔“

”میں چاہتی ہوں کہ تمہارے دل میں باپ بننے کی جو حسرت ہے وہ پوری ہو جائے۔“

”اگر یہ حسرت پوری نہ ہو تو۔؟“

”تو... مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ باپ بننے کے لئے دوسری شادی کر لیں گے۔“

اس نے ہنستے ہوئے اسے پگلی ”کہا۔ پھر سخیدگی سے سوچنے لگا۔ ”اگر ڈاکٹر نے خوش خبری سناتی تو سخیکار ہے۔“ ورنہ کوئی بڑی خبر بوبی کے نہ انوں تک نہیں پہنچن چاہتی۔ بوبی کا دل ٹوٹ جاتے گا کہ یہ کبھی بیرے بچے کی ماں نہیں بن سکے گی۔“

”آپ کیا سوچ رہے ہیں۔؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میں باپ بننے کے لئے ہر جائی بن کر دوسری شادی کر سکتا ہوں تو تم بھی ماں بننے کے لئے مجھے دھوکہ دے سکتی ہو۔“ وہ غصے سے پلٹ کر لی۔

”میں آپ کا منہ نوچ لول گی۔“

”پہلے مجھے تمہارا منہ نوچنا چاہتی۔ کیونکہ پہلے تم نے مجھ پر بے دفاع کا الزام لگایا ہے۔“

”میں نے اُس لئے کہا کہ مرد اپسے ہوتے ہیں۔ انہیں دوسری شادی کرتے دیر نہیں لگاتی۔“

”عورت تو رہنے جی مثلا میں قائم کی ہیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس دنیا میں بے وفا عورت پیدا ہوئی نہیں ہوتی۔“

”ہوتی ہے۔ مگر نہیں۔ ابھی نہیں ہوں۔“

”اوہ میں بھی ایسا نہیں ہوں۔“

”لبس جانے دیں۔ منہ کے سامنے بھی تجسس جایا کرتے ہیں۔“

”اسی لئے تو میرے سامنے جباری ہو۔“

”وہ پڑا گئی۔ با تحدی جوڑ کر لولی۔“

”مجھے معاف کر دیں۔ میر، آپ سے بحث نہیں کر سکتی۔“

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر نیٹ گئی۔ پھر سوچنے لگی۔ میں نے خواہ خواہ آصف کو ڈاکٹر زیدی کے پاس جانے کے لئے کہا دیا۔ اگر ڈاکٹر نے ان سے کہا دیا کہ وہ باپ نہیں بن سکتے تو ان کے دل میں تہشیہ بہتا اندر پیشہ رہے گا۔ مگر میں انہیں چھوڑ کر ماں بننے کی خاطر دوسری شادی کر دیں گی۔ مجھے آسف کے دلاغ سے اس شبہ کو مٹانا ہوگا۔

مگر کیسے۔؟

وہ سوچتی رہی۔ رات گزرتی رہی۔

وَحِيدٌ اپنے کمرے میں بیٹھا شراب سے شغل کر رہا تھا۔ زکا بھو  
کے سامنے شراب کا بام نہ ہا مگر خیالوں میں بوبی بول رہی تھی۔  
وَحِيدٌ! میں ابھی شراب ہوں جسے تم کبھی نہ پی سکے۔ مگر میراں شہ  
تھیشہ تھا رے رماغ پر چھایا رہتا ہے۔ اب تم مجھے دیکھتے رہو گے اور  
ترستے رہو گے۔"

وہ اپنے آس پاس دیکھنے لگا۔ وہ جہاں دیکھتا تھا وہاں بوبی  
نظر آتی تھی۔ وہ انہوں کرکھڑا ہو گیا۔ نشہ میں لڑکھڑا تاہوا بوبی کی طرف  
دیکھتے ہوئے بولنے لگا۔

بوبی! میں نے تمہیں پیار کا فریب دیکر چھوڑ دیا۔ مگر میں ظالم  
نہیں۔ نکوم ہوں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد میں نے انجمان کو ماں  
کی محبت اور باپ کی شفقت دی ہے۔ میں نے بہن کی زندگی سنوارنے

کے لئے صرف نہیں نہیں اپنے آپ کو بھی برباد کر لیا ہے میں کس طرح دل چیر کر دکھا دیں۔ اس دل میں اب تک تم ہی ہوا وتم ہی رہو گی۔“  
کھمرے کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ بوی کا خیالی پیکر فنا ہو گیا۔ ویب رنے چونک کردیکھا۔ بند دروازے کے پاس انہم کھڑی ہوتی تھی اور پوچھو رہی تھی۔

”بھائی جان! آپ نے میرے لئے کیسی قربانی دی ہے؟ کیا اسے قربانی کہتے ہیں کہ مجھے ایکہ ڈاکٹر بنانے کے لئے پری محبت کو چھپیں کر اسے بوی کے حوالے کر دیا۔؟“

”انجم! بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ میں نے بوی سے نہیں کہا تو  
کہ وہ مجھ سے مایوس ہو کر آسف سے شادی کر لے۔“

”آپ نے مجھ سے تو کہا تھا کہ میں شادی سے پہلے آصف کے اخراجات پر تعلیم حاصل نہ کر دیں۔ آپ جیسے بھائی کو غیرت آتی ہے۔ آپ نے بڑے بھائی کی چیزیں سے حکم دیا کہ میں تین سال کے لئے شادی سے انکار کر دیں۔ میں نے آپ کا حکم مان لیا۔ آصف مجھے سمجھاتے رہے۔ مناتے رہے۔ لیکن میں اسی عندر پر اڑی رہی کہ تعلیم کے بعد شادی کر دیں گی۔ اب آپ بتائیں کہ وہ آصف مجھے کہاں ملیں۔ کیسے ملیں گے؟“

کھوٹپڑی کے گنبد میں بہن کا سوال گو نجھنے لگا۔ ”وہ آصف مجھے کہاں ملیں گے کیسے ملیں گے؟“

انجمن نے کہا۔

آج میں نے بوبی کی خوش نصیبی دیکھی ہے۔ آصفہ اسے کتنا چاہتے ہیں۔ اس کے مشورے کے بغیر کوئی ایکم قدر نہیں اٹھاتے آپ نے کہا تھا کہ شادی کے بعد تعلیم داری نہیں رہتی، مگر بوبی (اتک) کا سچ میں پڑھ دی رہی ہے۔ آج مجھے آصفہ سے جو کچھ عمل کرنا تھا وہ بوبی حاصل کر رہی ہے۔ مجھے خوش نصیب بنائیں، ایک جگہ ای جان؟ آپ جواب دیں کہ میں بد نصیب کیسے بن سکتی۔

د جید ہار سے ہر نے جواری کو طلاق شد اب کے باہم کے پاس آیا۔ پھر اسے اٹھانا ہوا پڑا۔

شراب کی بیہ خوبی سے کہ اسے پی کر آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ آج میں یخ بول رہا ہوں۔ میں ایک ہی رات میں دو لمحہ میں جلنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میر سوچ رہا تھا کہ تم کھانی بہن اتنے اد پنچہ ہو جائیں اتنے اوپنے پوچھائیں کہ بوبی اور آصفہ جیسے لوگ ہیں سر اٹھا کر دیکھیں تو ان کی گردن دکھنے لگے۔

وہ بڑی۔

بے ایمانی کی دولت سے اپنی ہی گردن ٹوٹ جاتی ہے۔ آج ہمارے ہی سر جھک گئے ہیں۔

”نهیں انجمن! میں تمہارا سر نہیں مجھکرنے دون گا۔ فراستظامہ کرو۔ آمرفہ تمہارے آگے جگنے آگئے گا۔“

و کیسے ہے؟ انجمان نے بھرائی سے پوچھا۔

۰ آصف کی میدیا لیکل رپورٹ کل ڈاکٹر زیدی کے سامنے جائے گی  
لیکن میں نے آج ہی لیہار ڈری میں جا گردہ رپورٹ پڑھ لی ہے :  
انجمن نے آگے بڑھ کر لو چھا۔

"رپورٹ کیا ہے۔؟"

اس نے ایک گھنٹ پی کر کھرا۔

”وہ باپ نہیں بن سکتا۔“

”اونہ۔۔!“ اس بھن گھری سہم دردی سے اود کہر کر رہ گئی۔  
اس نے آپ حجا۔

”کیا یہ نہوش خبری سنکر تھیں خوشی نہیں ہوتی؟“  
اسخنے نے جیرانی سے پوچھا۔

و کیا یہ خوشخبری ہے۔؟

"ہاں۔۔۔ آصف باب نہیں بن سکے گا۔ لیکن بوجی مان بن سکے گی۔"

”کیا آپ کو سہت نشہر ہو گیا ہے؟ وہ تو کبھی ماں بن نہیں سکے گی۔“

وہ لڑکھر داتا ہمرا میر کے پاس آیا۔ وہاں ددبو تلیں رکھی سوئی جھیں۔

اس نے جام بھرنے کے لئے ایک بوتل اٹھاتی۔ وہ خالی تھی۔ وجید نے اسے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آصف کی طرح خالی ہے۔ مگر یہ جام ضرور بھرے گا۔ دوسری بوتل

" . . . .

اس نے دوسری بوتل کھولی۔ پھر اس بوتل کی شراب کو جام کے بلوریں  
بدن میں انٹیلینے لگا۔ ساتھی بڑپڑا لے لگا۔

”میں نے آج پہلی ملاقات میں ہی سمجھ لیا ہے کہ وہ ماں بننے کے لئے  
نڑپ رہی ہے۔ ہمارے سامنے وہ ترپنے کا انٹہار نہیں کر سکتی۔  
لیونکہ اس طرح شوہر کی شکایت ہو جائے گی۔ مگر تم اطمینان رکھو...“  
یہ کہتے ہوئے اس نے انہیں کی طرف رُخ کیا۔ وہ دیاں نہیں قدمی  
بھائی کو شراب کی بوتل کی طرف بڑھتے دیکھ کر کمر سے چلی گئی تھی۔ وہ  
اطمینان کا سالن لیتے ہوئے بولا۔

”چھا ہوا تم چلی گئیں۔ میں تمہارے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا  
تھا کہ.....“

اس نے شیش کے جام میں لکھرے کھاتی ہوئی شراب کو دریکھ کر  
کہا۔

”وہ میرے بچے کی ماں بنے گی.....“



بوبی اور آصف اپنے سکان کے سامنے موڑ سائکل پر بیٹھ رہے تھے۔ بوبی نے کہا۔

”میں نے کہہ دیا ہے پہلے ہسپتال جاؤ (گج)، رپورٹ دیکھوں گی اس کے بعد کام کج جاؤں گی۔“

”اور میں نے کہہ دیا ہے کہ پہلے تم کام کج جاؤ گی۔ آج تمہارا پہلا پرچہ ہے۔ تمہیں وہاں وقت سے پہلے پہنچنا چاہئے۔“  
اس نے گارڈی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ گارڈی کے سورمیں وہ زور سے بولی۔

”جب تک، مجھے رپورٹ معلوم نہیں ہوگی۔ میں سکون سے پرچہ نہیں دے سکوں گی۔“  
وہ اوپنی آداز میں بولا۔

”بوبی! تم میرا غرہ ہو۔ تمہیں سکون سے امتحان میں بیٹھ کر اچھے نمبروں سے پاس ہونا پڑے گا۔ میں انہیں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ عورت شادی کے بعد بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری ناکامی مجھے انہیں کے سامنے شرمندہ کرے؟“  
بوبی نے انکار میں سر ہلا بیا۔ پھر اپنا سر اس کی پشت سے شیکھ دیا۔

انہیں ڈاکٹر زیدی کے کمرے میں، سیمھی کسی امریض کے کیس پر محبت کو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔  
”کل صبح آپراشیں کا وقت متفرکر کر دو۔ اس کے سراکوئی چارہ نہیں ہے۔“

وہ بیز پر جھک کر کچھ لکھنے لگا۔ انہیں نے کہا۔

”ڈاکٹر! وہ، میر، میر آ صد فن کی روپورٹ دیکھنا چاہتی ہوں۔“  
”ہوں۔“ ڈاکٹر نے لکھنے کے دوران کہا۔ ”ٹرے میں ہے“  
انہیں نے آگے بڑھ کر فائلوں کی ٹرے میں سے ایک کاغذ ڈھونڈ کر زکالا۔ پھر اس سے بڑھتے بڑھتے مایوس ہو گئی۔

”اوہ! ڈاکٹر! میاں بیوی کو بڑا حمد مہ پہنچے گا۔“

”جھے افسوس ہے۔“

”کیا۔ ان سے یہ۔ یہ روپورٹ چھپائی نہیں جا سکتی؟“  
ڈاکٹر زیدی نے سراٹھا کروچھا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو۔؟“  
وہ سیھتی ہوئی بولی۔

”میں چاہتی ہوں کہ مسٹر آصف کو ایک خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے جھوٹی تسلی دی جائے۔ اگر آپ یہ لکھ دیں کہ ڈاکٹر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔“

”ڈاکٹر انہم! تم ایک ذمہ دار رکھ رہو، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر کے نسخہ میں ذرا سی تبدیلی آجائے تو مرلین کی حیان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔“

”مسٹر آصف مرلین نہیں، بد نصیب ہیں۔“

”ہاں۔ مگر وہ ایک مرد ہے اسے جوانمردی سے اپنی پرنسپیلی کو فیس کرنے دو۔ جھوٹ سے غلط روپوٹ کی توقع نہ کرو۔ دیسٹر آن۔“  
وہ ماپوس ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ چھر آہستہ آہستہ ہلنے لئے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں فون کی لفڑی بج رہی تھی۔ ہس نے یہ رکے پاسا آ کر ریسیور اٹھایا۔

”چیزوں...“

دوسری طرف آصف ریسیور اٹھائے ہوئے تھا۔ بو بی بے چینی سے ریسیور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آصف نے کہا۔

”ہمیلو انہم! میں بو بی کے کالج سے فون کر رہا ہوں۔ یعنی یہ بو بی ضد کر رہی ہے کہ یہیں سے روپوٹ معلوم کروں۔ کیا تم ابھی

بنا سکتی ہو؟ ”  
انجمن بچکچا نے لگی۔ پھر لوٹی۔

” اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ یہاں آؤ، ہم ڈاکٹر زیدی کے پاس جا کر معلوم کریں گے۔ ”

” بہت دیر ہو جائے گی۔ بوبی کا پرچھہ شروع ہونے والا ہے۔ میں چانتا ہوں کہ یہ مطمئن ہو کر امتحان ہال میں بیٹھے... ”

” اسے مطمئن کر دتا کہ وہ کسی ایک امتحان میں تو کامیاب ہو سکے۔ ”

” آں... ” آصف پھر کھڑک گیا۔ بوبی نے پوچھا۔

” کیا ہوا۔ ”

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔

” خوشخبری، بالکل خوشخبری ہے۔ قم ماں بن سکتی ہو۔ ”

بڑھی پرنسپل دیرے پھاڑ کر بوبی کو دیکھنے لگی۔ بوبی نے کہا۔

” یہ تو میں جانتی ہوں۔ یہ پوچھو کر تم باپ بن سکتے ہو یا نہیں؟ ”

” بھتی یہی تو خوشخبری ہے کہ بن سکتا ہوں۔ ”

پرنسپل عینک لگا کر آصف کو گھور نے لگی۔

بوبی نے آصف کے ہاتھ سے ریسیور چھپیں کر کھا۔

” سہیلو انجمن! کیا یہ سچ ہے۔ ”

انجمن نے کہا۔

” تعجب ہے، تمہیں اپنے شوہر کے سچ پر لقین نہیں ہے۔ ”

”یہ بات نہیں ہے۔ ایسی خوش خبری ڈاکٹروں سے کم ملتی ہے  
اس لئے میں کنفرم کرنا چاہتی تھی۔“

”ایٹ از کنفرمڈ۔ اب امتحان ہال میں جاؤ۔“

آصف نے بوی سے ریپورٹ یسکر کیا۔

”میں ابھی آرہا ہوں؟“ پھر ریپورٹ کر کر بوی کو دیکھنے لگا۔  
اس کے چہرے پر جیری مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا۔

”اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا۔ چلو۔۔۔۔۔“

شھوڑی دیر بعد بوی امتحان ہال میں بیٹھی، قلم منہ میں دبائے  
مسکراہی تھی، سوچ رہی تھی اور لکھتی جا رہی تھی۔

کاریج کے احاطے میں آصف کھڑا دوڑا امتحان ہال کی طرف اداس  
نظر وں سے دیکھ رہا تھا۔ بوی کو سکون سے لکھنے دیکھ کر اس نے اطمینان  
کی سانس لی۔ پھر اسے پہنچانے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے  
پلٹ کر دیکھا۔ بوڑھی پرنسپل کھڑی ہوئی تھی۔ دہنجیدگی سے بوی۔

”یوں آرے گذ بوانے۔ اگر بوی کو تم جھوٹی تسلی نہ دیتے تو وہ  
اتنی مطمئن ہو کر ہال میں نہ بیٹھتی۔“

آصف نے تعجب سے پوچھا۔

”آ۔ آپ نے کیسے جان لیا کہ میں نے جھوٹ کہا ہے؟“  
وہ مسکرا کر لولی۔

”بیٹھے! فیس ریڈنگ میری ہابی ہے۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ

تم باب نہیں بن سکتے ...."  
آصف کا باتھبے اختیار اپنے چہرے پر گیا۔  
بہت ہی دل برداشتہ نظر آ رہا تھا۔



”مُحِسْ نے کر سکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”بچھے افسوسی ہے آصف! اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تہاری تقدیر کو بد لئے کی ضرور کوئی تدبیر کرتی۔“  
 آصف ایک کر سکی پر بیٹھا میدانیکل رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اس نے سراٹھا کر کھا۔  
 ”سب ہی تدبیر کرنے ہیں پھر بھی تقدیر نہیں بدل سکتے۔ مجھ میں جو کمی ہے، اس کا مجھے دکھ ہے، لیکن بوبی کی فکر زیادہ ہے۔ یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد وہ امتحان کا ایک پرچہ بھی اٹینڈ نہیں کر سکے گی؛  
 وحید نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”سید صی سی بات ہے، اسے یہ رپورٹ نہ دکھاؤ۔“  
 ”وہ ضرور دیکھنا چاہے گی۔“

انجمن نے کہا۔

”تم کیسے شوہر ہو، اپنی بیوی کو بہلا نہیں سکتے۔“  
”وہ بھی نہیں ہے، مگر بچوں سے زیادہ ضدّی ہے۔“  
دحید نے کہا۔

”ضدّی بچوں کو کھلونا دیکر بہلا یا جانتا ہے۔“

انجمن سنبھلے لگی۔ آصف نے ناگواری سے پوچھا۔

”کیا تم دونوں میری مجبوریوں کا مذاق اڑارے ہے ہو۔؟“  
انجمن سنجیدہ ہو گئی۔

”نہیں آصف! تم غلط نہ سمجھو۔ میں تمہاری پریشانیوں کو اپنی  
پریشانیاں سمجھ کر.....“

آصف اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم نے کب میری اپریشانیوں کو سمجھا ہے؟ میں گزرے ہوئے  
وقت کو سھول نہیں سکتا اور نہ تم دونوں سھول سکتے ہو۔ میری مجبوریوں  
پر سنبھل کا یہ اچھا موقعہ ہاتھ آیا ہے۔“

وہ جانے لگا۔ انجمن اپنی جگہ سے اٹھی ہوتی بولی۔

”رک جاؤ آصف! آج میں تمہاری ساری شکا بیتیں دور کر  
دou گی۔!“

دحید پلٹ کرا سے سوالیہ نظر دیں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔

”تمہاری پریشانی میری پریشانی ہے۔ میں اسے بعد کر دوں گی۔“

تمہاری اس روپرٹ کو غلط ثابت کر دوں گی۔"

"کیسے۔؟" آصف نے پوچھا۔ انہم ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔ پھر اس نے وہ کاغذ دھید کو دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! اگر آپ دولت کی خاطر بوبی کو دھوکہ نہ دیتے تو آج میں آصف کی نظر دوں سے اپنے نہ گرتی۔ اب اس غلطی کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ہم بوبی کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے جھوٹی روپرٹ تیار کریں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ جرم ہے۔ مگر میرے نیک ارادوں کو خدا سمجھ رہا ہے؟ دھید نے انہم کے ہاتھ سے کاغذ لیکر دیکھا۔ پھر آصف کو دریکھتے ہوئے کہا۔

"میری بہن نے بڑی سے بڑی رقم کو ٹھکرایا۔ مگر آج تک تمھی کسی کو جھوٹا سرٹیفیکٹ نہیں دیا۔ آج تمہارے لئے یہ اپنے مقام سے گردہ ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔ آصف نے نرامت اور احسان نندی سے انہم کو دیکھا۔ دن منہ پھر کھڑکی کے پاس چل گئی۔ ... وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"انہم! میں نے پریشانی کی حالت میں جو کچھ کہا اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں... میں فرمندہ ہوں۔"

اس کی آنسو بھری آداز سنائی دی۔

"تم مجھے کبھی سمجھ نہ سکو گے۔ میں پہلے بھی تمہیں چاہتی تھی۔ آج

بھی تمہارے لئے زندہ ہوں ۔۔۔ یہ میرے پیار کی سچائی ہے کہ میں نے کسی کے لئے سہاگ کا جوڑا نہیں پہننا اور نہ کبھی پہنول گی ۔۔۔

” یہ تمہاری ضد ہے ۔۔۔ ”

” اگر ضد ہوتی تو میں تمہیں بوبی سے چھین لینے کی ضرور کو شکر تی ملگا میں جھوٹی تسلی کے سمجھے اسے نئی زندگی دے رہی ہوں ۔۔۔ ”

” تم ۔۔۔ تم بہت اچھی ہو انجم ۔۔۔ ”

” وہ آیکے سرد آد بذر کر لو ۔۔۔ ”

” آہ ! برسوں بند تم نے انجم کھا ہے ۔۔۔ ”

وہ کچھ پر لیٹاں ہو گیا ۔۔۔ پھر، پھر کچھ پاٹے ہوئے بولا۔

” میں تم سے ایک نیکو اور چاہتا ہوں ۔۔۔ ”

” میں کبھی انکار نہیں کر دیں گی ۔۔۔ ”

” میں چاہتا ہوں کہ بوبی کو کبھی حقیقت معلوم نہ ہو ۔۔۔ وہ جھوٹی تسلی سید بہاتی رہے ۔۔۔ ”

” یعنی میں اس کے سامنے کبھی زبان نہ کھوں ۔۔۔ ”

” ہاں ! آج میں نے امتحان ہاں میں دیکھا ہے ۔۔۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی ۔۔۔ ”

انجم اس کی طرف پڑھ کر بوجی۔

” وہ ہمیشہ خوش رہے گی ، یہ برا وعدہ ہے ۔۔۔ تم دعوہ کرو کہ مجھ سے طلتے رہو گے ۔۔۔ ”

"مُمِم... میں... مگر..."

"کیا کسی سے ملنا گناہ ہے؟"

"نہیں۔ مگر نہ بولی۔؟"

"تم بوبی سے نہیں، مجھ سے ڈرتے ہو، آصف! میں وہ آگ ہوں جس نے تمہیں کبھی نہیں جلاایا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا نہیں سکتی۔ مگر کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے دستی کا فریب تو کھا سکتی ہوں۔"

وہ پس دپشیں میں رہا۔ انجمن نے اس کا ہاتھ تھام کر کر چاہا۔

"تالی دونوں ہاتھوں سے بھتی ہے۔ میں تمہاری خاطر بوبی کو جبوٹی تسلی دے رہی ہوں۔ تم مجھے جبوٹی دوستی ہی دے دو۔"

آصف کی نظر ہی جبک گئیں۔ وہ انجمن کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔



بوبی کا بچ کے بس اسٹاپ پر کھڑی انتہا رکر رہی تھی۔ دحید کی کار اس کے سامنے آگر کر گئی۔

"ہیلو بوبی!" دہ اگلی سید دے کا دردازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "فار یور انفار میشن۔۔۔ آصف تمہیں لینے نہیں آئے مگر یہ دیکھو۔۔۔"

اس نے ایک تھہ کیا ہوا کاغذ بوبی کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے کھلن کر پڑھنے لگی۔ آصف نے لکھا تھا۔

"بوب! رفتر میں بہت کام ہے۔۔۔ میں شام تک مصروف ہوں۔۔۔ میں نے انجمن کو فون کیا تھا۔۔۔ وہ تمہارے لئے گاڑی بچ رہی ہے۔۔۔ بلا تکلف گھر پی جاؤ۔۔۔ تمہارا اور صرف تمہارا آصف."

وہاں سے دور، بہت دور آسف کی موڑ سانچیکل تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ آصف کے پیچے انجمن اس کا کمر میں یا تھڈائے

بیہمی تھی۔ گاڑی کا انجن شور مچا رہا تھا۔ انجن نے ادنی آداز میں پوچھا۔

”کیا سوچ رہے ہو۔؟“

”سوچ رہا ہوں۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے آج بوبی سے دوسرا جھوٹ بولنا پڑا۔“

”لہ یہ بھو سچو کہ یہ جھوٹ کتنا خوبصورت ہے۔؟“  
انجن نے یہ کہہ کر انہی سالن لیتی ہوئی جوانی کا بوجھا اس کی اپنی پرڈال دیا۔

بوبی کا کمی سیٹ پر خاموش بیٹھی ہوتی تھی۔ وحید نے ڈرائیور کرنے کے دوران سے کن انگھیوں سے دیکھا پھر کہا۔

”بوبی! انسان کی اعلیٰ ظرفی یہ ہلتی ہے کہ وہ کچھلی رنجشیں مُبتلا دیتا ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں کہ تمہیں آصف جیسا جیون ساتھی مل گیا۔ مگر تم اب تک مجھ سے ناراض ہو۔؟“

”میں ناراض نہیں ہوں، سوچ رہی ہوں۔؟“

”میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہی ہو؟“

”کیا تم ٹیکی پتھی جانتے ہو؟“

”ہاں۔ وہ ڈلیش بوڑکھوں کر دیکھو۔ دہاں تمہاری سڑی ہوئی باتیں ایک کاغذ پر لکھی ہوئی ہیں۔“

”اچھا۔!“ بوبی نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر ڈلیش بو روڈ کو

کھول دیا۔ اس کے اندر سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگی۔ دوسرے  
ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔  
رجید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ ہے۔ رپورٹ نہیں خوشخبری  
ہے۔ اس خوشی میں اب تو مجھے معاف کر دو۔“  
وہ خوش ہو کر بولی۔

”جاو معاف کیا۔“

”اب تو کون رنجش نہیں ہے؟“

”نہیں ہے۔“

”کوئی شکایت نہیں ہے؟“

”نہیں ہے۔ نہیں ہے۔“

”تو چھر آج کسی لچھ سے ہو ٹھل میں پنج کریں۔“  
وہ گھوڑ کر بولی۔

”تم تو انگلی پکڑتے ہیں پونچا پکڑنے لگے۔“

”اس میں بھی تمہارا فائدہ ہے۔“

”ذراسنوں تو، کیا فائدہ ہے؟“

”پہلے پنج کا وعدہ کرو۔“

”اچھا وعدہ۔ اب تباو۔“

”دیکھو، پنج کے بعد میں سیدھا گھر جاؤ گا۔ ٹوپی پہن کر نماز پڑھوں گا۔“

پھر عالمگوں چکا۔ اے خدا! جتنی جلدی ہو سکے بوبی کے گھر میں ایک  
نخنے سے ہمان کو بھیج دے۔ . . . . .  
بوبی نے شرما کر کھڑکی کی طرف منہ پھیر لیا۔ وہ اپنی مسرتوں کو چھپا  
کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

پھولوں کے جھرمنٹ میں آصف سر جھبکاتے بیٹھا ہوا تھا۔ انہم  
نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے لئے ایک خوبصورت ساتھی لائی ہوں۔ آنکھیں  
بند کرو۔“

وہ جبراً مُسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا اس تخفیف کو بذر آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے؟“  
”ہاں! پہلے آنکھیں تو بند کر د۔“

آصف نے آنکھیں بند کر لیں۔ انہم نے ایک گلاب کا پھول  
آگے بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ آصف نے سانس کھینچ  
کر اس کی خوبصورتی کو محسوس کیا۔ پھر آنکھیں کھول دیں۔ لیکن کھلنے ہوتے  
گلاب کو دیکھ کر درجھا گیا۔

انہم نے پوچھا۔

”کیا ساتھی پسند نہیں آیا۔؟“  
وہ پھول کو باتھہ میں لیکر گھری سفیدگی سے اُسے دیکھنے کے بعد بولا۔  
”وہ بہت خوش ہو گی کر اس کی گود میں پھول کھلنا والا ہے۔“

بوجی اپنی خواہبگاہ میں گنگناتی ہوئی بستر کی چادر درست کر رہی تھی۔ اس نے ایک خوش رنگ سازدھی پہنی ہوئی تھی۔ سازدھی ایسے سلیقے سے پہنی کئی تھی اور بدن کے لشیب دفر از چینخ رہے تھے۔ وہ قدر آدم آئینے کے سامنے آ کر اپنا آپ دیکھنے لگی۔ پھر اس نے جوڑے میں لگی ہوئی سچولوں کی وینی کو درست کیا۔ آئینے میں دور ایک دیوار پر بے پسگی تصویرِ نظر آ رہی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پچھے مسکار رہا تھا۔ وہ بھی مسکرانے لگی۔ گنگناتی ہوئی تصویر کے پاس پہنچی۔ اسے دیوار سے الگ کر کے اپنے سینے سے لگایا۔ پھر انکھیں بند کر لیں۔

جب اس نے آنکھ کھولی تو وہ بستر کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے تصویر کو بڑے پیار سے چوم کر اسے پلٹ کر کے سر رانہ اوپر کے ایک

ریک پر رکھ دیا۔ پھر فرا پیچے جا کر اسے دیکھنے لگی۔ بچہ مسکراتا تھا۔ وہ اور پیچے گئی۔ میں جبو متی ہوئی، گلگناقی ہوئی۔ سوچ بورڈ کے پاس آگئی۔ روشنی میں خالی سیخ تھی، اور مسکلتا ہوا اس بچہ تھا۔

بوبی نے سوچ آف کیا۔ اندر چلا جھاکیا۔ خیالوں میں بہت ساری مترجم آوازیں گلگناڑی ہی تھیں۔ اس نے سوچ آن کیا۔ روشنی میں خالی بستر ہے۔ بچوں کی پیشیاں برس رہی تھیں۔ بچہ مسکراتا تھا۔ رات، گلگنا رہا تھی۔

اس نے پھر سوچ آف کیا۔ تاریکی چاگئی۔ ساتھ ہی ایک بچے کی شہد بھری آواز سنائی دیا۔

“ما۔ ما۔ آن ما...”  
اس نے جلدی سے سوچ آن کر دیا۔ لبتر خالی تھا۔ وہ اپنے دھڑ کھوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر خواب زده سی ہو کر مسکراتے ہوئے بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ساعت میں اب تک مترجم آوازیں گلگناڑی ہی تھیں۔ آصف خواب گاہ کے دروازے پر ٹھرا ہوا بوبی کی خوشیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے جنبات کو سمجھ رہا تھا۔ اور کہری ادا اس مشکلت خورد نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بوبی بچے کی تصویر دیکھنے میں محو تھی۔ ایسے وقت تصویر کے شیشے میں آصف نظر آیا۔ ایک ہی فریب میں مسکراتا ہوا بچہ بھی تھا اور اس کے ساتھ بوبی اور آصف کا عکس بھی نظر آ رہا تھا۔

بوبی نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو وہ عین نکاحوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے سولہ سنگھار کو دیکھ رہا تھا اور ساڑھی کے ڈھلنے ہوئے آنچل کے پیچھے تک رہا تھا۔ سانس لیتا ہوا سینہ جیسے جذبوں کے ہجوم میں ہانپ رہا تھا۔ وہ شرما تھا ہونی اپنے آنچل کو سینے پر درست کرنے لگی۔ آصف نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر وہاں گنگنا ہیں اس کی سعادت میں گوشچنے لگیں۔ آصف نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ جاگتی ہوئی شب، پھر ہمکتا ہوا شباب، یہ روپ سنگھار، یہ گوری باتوں کا ہمارا میرے لئے ہے۔"

بوبی کی مسکراتی آنکھوں، اور خاموش جذبوں نے کہا۔

"ہاں تیر سے لئے تیرے لئے ہے۔ پھر تیری آنکھوں کے سندھ سپنوں میں ایک شہزادہ مجھے بلاتا ہے۔"

"کون ہے وہ۔ ذرا نام تو بتاؤ۔"

"وہ تیر سے میرے پیار کا سایہ ہے۔ جب تو میرے ہاس ہوتا ہے۔ وہ بھی دل کے قریب ہوتا ہے۔"

بچے کی تصویر مشکرا رہی تھی۔ بوبی شرمیلی اداوں سے پھولوں بھری سمجھ پر لیٹ رہی تھی۔ آصف نے اداس نظروں سے بچے کی تصویر کو دیکھا۔ پھر بوبی کی خاطر مسکراتے ہوئے اس پر جگنے لگا۔ بوبی کی خاموش ادایت بول رہی تھیں۔

"جب تیرے پیار کی سیع پر ہوتی ہوں۔ وہ میری سیع کے پالنے میں جھولتا ہے۔ میرے محبوب مجھے بتا۔ میرے سونے آنگن میں تیرا چاندنی کب کھلے گی۔ . . . ؟"

آصف نے سے پیار سے برت رہا تھا۔

"ٹاید یہی وہ رات ہے۔ ہاں شاید یہی وہ رات۔ . . ."۔  
بچے کی مسکراتی ہوئی تصویر پر اچانک کمرے کی تاریکی چاگئی۔  
لیکن کھڑکی سے آنے والی مددھم روشنی میں وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

ہنوز

وقتے گزرتا جا رہا تھا۔ مدرسائیک پرآصف کے پیچے کبھی بوبی سُجھتی تھی اور کبھی انہم اس کی پشت سے لگی گھومتی پھرتی نظر آتی تھی۔

ایک بار بوبی نے آصف سے شکایت کی۔

”اب تم روز بھی دفتر سے لیٹ آنے لگے۔ آخر یہ دفتر کام اچانک کیسے بڑھ گیا ہے؟“

”بھئی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ دفتر کام ہے۔ کبھی کم ہوتا ہے، کبھی بڑھ جاتا ہے۔“

”امتحانات ختم ہو چکے ہیں۔ کاسٹ بند ہو گیا ہے۔ میں بھاں ایسی بور ہوتی رہتی ہوں۔“

”میں کوشش کروں گا کہ کام جلد ختم ہو جائے اور آج توہماری

شادی کی چوتھی سالگرہ ہے۔ آج میں چار بجے سے پہلے آ جاؤں گا۔ انہن اور وحید کو بھی ٹیکلیفون کر دوں گا۔ بڑا نہ گامہ رہے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔؟"

دہ خوش ہو کر مسکراتی ہوتی مکان کے احاطے تک آئی۔ آصف نے گیٹ کھول کر باہر جاتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو گھر میں ہی رہوگی نا بوجبی۔؟"

"باں۔ کیوں بی؟"

"دہ۔" اس نے ہمچکیا تے ہوئے کہا۔ "دستہ تی کا رخانے سے موڑ سائیکل سیکر آئے تھا۔ ایسا نہ ہو کہ تم شاپنگ کے لئے جاؤ اور مستری گاڑی لا کر واپس لے جائے۔"

"نہیں۔ میں گھر میں رہوں گی۔"

دہ مطمئن ہو کر مسکرا تاہما چلا گیا۔

انہن سہیپتال میں بیٹھی ہوتی آیکے مریضہ کے لئے نسخہ لکھ رہی تھی۔ اس نے مریضہ کو نسخہ دے کر رخصوت کرنے کے بعد تھکے ہوئے انداز میں گھری سانس لی۔ پھر پوالنگ چیز کی پشت سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی۔ سوچتے سوچتے اس کے بیوں پر مشکر اہٹ آئی۔ پھر جھینیز پر جوک کر ٹیکی فون کا رسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

وحید سہیپتال کے کارپیڈ در سے گزر رہا تھا۔ دہ انہن کی آواز سیکھ رے کے دروازے پر لک گیا۔ انہن ریلوالونگ چیز پر گھومتی ہوئی

کہہ رہی تھی۔

”ہیلو آصف! کیا ہو رہا ہے؟“

آصف نے دوسری طرف سے کہا۔

”ہو گا کیا؟“ تم بھے فتر میں چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتیں ایسا کب تک ہو گا انجم؟ بوبی آج ہی شکایت کر رہی تھی کہ.....“  
انجم نے سنتے ہوئے کہا۔

”کہ شوہر حضرات کو دیر سے گھر نہیں آنا چاہیے۔ اچھا ایسا کرد۔ آج میں جلدی آ جاتی ہوں۔ تمہیں جلدی چھٹی دے دوں گی۔ اد کے؟ آں۔ نہیں؟ اچھا۔ ہاں۔ اوہ، دیری گذ۔ آج تمہاری شادی کی سالگرو ہے۔ پہلے کیوں نہ بتایا؟ بوبی تو بڑی خوش ہوگی؟“ دھید سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ انجم ہوں ہاں کر رہی تھی وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا در دا زے سے دا اپس چلا گیا۔



بوبی اپنے کرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کارخانے کا  
مستری احاطے کا گیٹ کھول کر موٹر سائیکل لار باتھا۔ وہ کھڑکی سے  
پلٹ گئی۔ سنگھار میز سے پرس اٹھا کر نیزی سے چلتی ہوئی مکان سے باہر  
آئی۔ سپھر پس کھولتے ہوئے مستری سے پوچھا۔  
”کتنا بیل ہے؟“

دہ تو ہم صاحب سے لے لیتے ہیں۔ اس لئے میں بالیک نہیں

آیا۔ اچھا سلام۔۔۔

”دہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ بوبی نے ایک نظر موڑ سایکل پڑائی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوتی محلان میں داخل ہوتی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اس کے بعد راہداری سے گزر نہ نکلی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے بے زار ہم سے

پڑھ کر درد دارے کو دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اسے کھول دیا۔  
درد دارے پر دھیڈا پنے دونوں ہاتھوں سے ایک بہت بڑے  
پیکٹ کو سنبھالے کھڑا تھا۔ اس نے پیکٹ کے پیچے سے جھانکتے ہوئے  
کہا۔

”شادی کی سالگرہ مبارک ٹوٹو۔۔۔“

وہ مسکراتی ہوتی بولی۔

”تقریب شام کو ہے۔ تم ابھی سے کیوں چلے آئے؟ چلو آجائو۔“  
وہ اندر آیا۔ پھر اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

”تمہارے آصف عاصب کہاں ہیں؟“

”دنتر گئے ہیں۔“

”سالگرہ کے دن بھی دفتر؟ تمہارا شوہر تو بہت ہی تھرڈ کلاس  
آدمی ہے۔!“

”اے۔ انگوٹھ پلیز!“

وہ ڈرائیور، روم کے سینیٹر پبل پر سامان رکھتے ہوتے بولا۔  
”کوئی بھی سنبھالنے کا تو یہم کہے گما۔ اگر تم اپنے شوہر کو تھرڈ کلاس کے  
بجائتے فرست کلاس بنانا چاہتی ہو تو چلو ہم اسے پکڑ کر بہاں لائیں اور  
اسے سمجھائیں کہ کام تو عذر ہوتا ہے۔ سالگرہ سال میں ایک دن منائی  
جاتی ہے۔“

”ابھی میں یہی سوچ رہی تھی۔ تمہاری میں دل گھبرا رہا تھا اگر۔۔۔“

وہ صوفی پر بیٹھ گئی۔

"جب سوچ لیا ہے تو اگر مجر کچھ نہیں۔ آصف کی موڑ سائیکل موجود ہے یہاں سے میرے ساتھ چلو۔ وہاں سے آصف کے ساتھ چلی آنا۔"

وہ سوچنے لگی۔ وجید نے پوچھا۔

"کیا تم نے آصف کے لئے کوئی تحفہ خریدا ہے؟"

"یہی تو بریشافی ہے کہ اب تک نہیں خریدا۔"

"تو پھر سیمی کیا سوچ رہی ہو؟ چلو انہوں نہیں۔"

اس نے بوبی کا یا تھے پکڑ کر کھینچ لیا۔

وہاں سے دوسرے انہم کا درود ایڈ کر رہی تھی۔ آصف اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ انہم نے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں تمہیں کیا تحفہ دوں۔؟"

"ہر ایک کے ساتھ یہی پرالہم ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ بوبی کے لئے کون ساتھی خریدوں۔؟"

وہ مسکراتی ہوتی بولی۔

"در اصل تم بوبی کو خوش کرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں خوش کرنا چاہتی ہوں۔ ہم سب ایک دوسرے کو جیتنے کے لئے تحفے کی رشوت دینے کے عادی ہو گئے ہیں۔"

"یہ غلط ہے۔ میں تو بوبی کو جیت چکا ہوں۔"

"جیتنے کے بعد بھی جیتنے کو کچھ رہ جاتا ہے۔"

آصف کے چہرے پر اش ردگی چھائی۔ وہ آہستگی سے بولا۔

"میں سمجھتا ہوں — مرد اپنی عورت کو اولاد کا تحفہ دے کر  
ہی مکمل طور پر جیت سکتا ہے۔"



درسترن کے چپر اسی نے بوبی اور وحید کو دیکھتے ہی کہا۔  
”السلام علیکم بیگم صاحبہ! صاحب تو جا چکے ہیں۔“  
بوبی نے وحید سے کہا۔

”اتنی عدد آنا بے کار ہوا۔ صاحب اپنے وعدے کے مطابق جلدی گھر پہنچ گئے ہیں۔“

”آصف، گھر نہیں جائیگا۔ پہلے شاپنگ کرے گا۔ تمہارے لئے تحفے خریدے گا۔ تم بھی کچھ خرید تر جاؤ۔“

تمہارے لئے ہونے لفٹ میں آتے لفٹ بیچے بانے لگی۔  
بوبی نے کہا۔

”بیکھر مشورہ دو۔ آصف کے لئے کیا خریدنا چاہیتے ہے؟“  
”فارلن کا کوئی بہترین آئندہ ہونا چاہیتے ہے۔ آصف جیران رہ جائیگا۔“

”ہاں ! میں بھی اسے سر پر اتر دنیا چاہتی ہوں۔“  
وہ لفٹ سے باہر آئے۔ پھر عمارت کے باہر جاتے ہوئے دجید  
نے کہا۔

”تم نے سپریاں دے کی ماکریٹ دیکھی ہے؟“

”ہاں — مگر وہ بہت دور ہے۔“

دجید نے موڑ سائیکل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”جہاں گاڑی ہو وہاں فاصلے سمت جاتے ہیں۔“

”مگر آسمان کو دیکھو — بافل چوار ہے ہیں۔“

”یہ گرجنے والے ہیں — بر سفر رالے نہیں ہیں۔ ہم ادھر جائیں گے  
اُدھر آئیں گے — چلو دیر نہ کرو۔“

بوپی اس کے پیچے بیٹھ گئی — موڑ سائیکل اسٹارٹ ہو کر اپنی  
رفتار دکھانے لگی۔

گرجنے والے بادل کبھی برس بھی جاتے ہیں۔ انہم اور آصف نے کار  
کی لکھڑکیوں کے شیئے چڑھا دیتے تھے — بارش کا پانی شیئروں کے باہر  
بیرونی مناظر کو دھنڈ لایا تھا۔  
انہم نے کہا۔

”یہ توبے وقت کی بارش شروع ہو گئی۔“

”ہاں — اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔“

"پہلے میرے گھر چلو۔ میں بس تبدیل کروں گی۔ پھر بوبی کو مبارکباد دینے تھا۔ اس ساتھ چلوں گی۔"

"ہمارا ایک ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے؟"  
آصف نے اچانک گھبر کر کہا۔

"ارے۔ مگاڑی روکو۔۔۔"

امجمون نے بدحواسی میں اسٹیشنگ کو گھایا۔ کار ادھر سے ادھر ہونے لگی۔ پہنچے اور بیک کی آواز میں گڈ مڈ ہرنے لگیں۔

سپر بائی وے کے سنائے میں بوبی کی چیخ عدالتک ہراتی چلی گئی۔ موڑ سائیکل ایک طرف گردی تھی۔ اس کے دونوں پہنچے تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ دوسری طرف بوبی زمین پر پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منتظر گھوم رہا تھا۔ دیجید نے اس پر جبک کر پوچھا۔

"سوری بوبی! خیریت سے ہونا؟"

بوبی نے لٹھنے کی کوشش کی۔ دیجید اسے ہمارا دینے لگا۔  
دونوں ہارش میں بھیگ رہے تھے۔ سامنے بہت دور ایک جعلی نظر آ رہی تھی۔ دیجید نے کہا۔

"ذرا سمت سے کام لو۔ یہیں اس جھگی میں پناہ مل جائے گی۔!"  
بوبی نذر حال سی ہو کر اپنے بن کا سارا بوجھو دیجید پر ڈال کر لڑکھڑا۔

ہوئی چلنے لگی۔!

انجمن نے اپنی خواب گاہ کی الماری سے ایک لباس نکال کر دوڑ  
بیٹھنے ہوئے آصف کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔

” یہ لباس کیسار ہے گا۔؟ ”  
” اچھا رہے گا — فارگاڈ سیک جلدی چلو۔ بوبی انتظار

کر رہی ہوگی۔ ”  
” تم خواہ مخواہ جلدی کر رہے ہو۔ اگر حادثہ ہو جاتا تو ہم گھر پہنچنے کی  
بیان نے سپتال میں ہوتے۔ ”

انجمن لباس لیکر پا تھوڑم چلی گئی۔ با تھوڑم کا دروازہ کھلا رہا۔ آصف  
نے کہا۔

” میں گھر پہنچا نہ سپتال۔ حادثے نہ ہوں۔ قبھی ہم کہیں سے  
کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ”

بوبی کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ وجید اسے سہارا دیکھ رکا  
چار پانی پر لٹا رہا تھا۔ اس کا لباس پانی سے بھیگ کا ہوا تھا۔ اددہ سردی  
سے کافی پر رہی تھی۔ وجید نے چُلگ کے کمر سے سے باہر آ کر ایک بوٹھے  
سے کہا۔

” مگر ماگرم چانے پلا دو۔ پیسوں کی فکر نہ کرو۔ یہ لو۔ ”

اس نے جیب سے دس دس کے کئی نوٹ لکال کر بوڑھے کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اُدھر نہ آنا۔ چاٹے لینے میں خود ہی آجائوں گا۔"

بوڑھانوٹوں کو ریکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وحید نے کرے میں آکر جھگی کے دروازے کو بند کر دیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ اندر کل سنائی دی۔ بوبی آنکھیں بند کئے سردی سے کانپ رہی تھی۔

وحید نے اپناؤٹ اتار لیا۔ پھر اسے دونوں ہاتھوں سے چھپلا کر یوں بڑھنے لگا۔ جیسے بونی کے چینے سے پہلے اس کی چینے کو کوٹ کے سلنے میں دبو چنا چاہتا ہو۔ سیاہ کپٹ کی سیاہی چھپلاتی آرہی تھی۔ اچانک بوبی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا اس پر کوٹ کی کالک چمیل گئی تھی۔

اس سیاہی میں ایک انسانی چینے سنائی دی۔

آصف اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ درستا ہوا باہر درم کے دروازے پر آیا۔

"کیا ہوا نجم؟"

ایک چہرہ اُدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔ انہم پھر ایک بار چھپتی ہوئی باہر درم کے دروازے کے پچھے سے نکل کر آصف سے پٹ گئی۔ جیسے بھڑکتے ہوئے شعلے اگر لپٹ کئے ہوں۔ دہ ایک درم سے بوکھلا گیا۔ انہم

کی ننگی باہر ہیں گلہ کا ہار بن گئی تھیں ۔ آنکھوں کے سلامتے مکھ جیسے گورے  
گورے، چکنے چکنے شانوں پر زنگا ہیں پہلی رہی تھیں پھر دونوں کے  
چہرے ایک دوسرے کے سلامتے آگئے ۔ انہیں کی آنکھوں میں خمار  
چھاڑا تھا۔ پیاس سے لب تھر تھر اڑے تھے ۔

پھاریا کے پیچے بہ سرسرے  
آصف اپنے ہاتھوں کو اپنی گردن پر لے گیا۔ اس کی گردن پر اجنبی کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں الجھی ہوتی تھیں۔ وہ اس الجھن کو سلبوانے لگا۔ انگلیاں آہتہ آہتہ ایک دوسری سے چھوٹے اور آگ ہونے لگیں۔ پھر باہول کا سچنڈہ ٹوٹ گیا۔ وہ تیزی سے پلت کر جانے لگا۔

دہ راستہ روک کر کھڑی ہو گئی  
یوں چھوٹ کر نہ جاؤ۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

"اور مجھے تم سے دُر لگتا ہے۔"

وہ اپنی اداوں سے روکنے لگی۔

بھری برسات میں بھری جوانی کی ادائیں گنگنا رہی تھیں۔ یہ کترارہا  
تھا۔ وہ اترارہی تھی۔ اپنے شباب کے روشنی پہنچوں میں بالجھا رہی تھی  
آخز کسی طرح اس نے خواب گاہ سے باہر آگر درد اڑے کو باہر سے بند کر دیا۔  
وہ اند در عانہ پستی رہ گئی۔ اور وہ باہر بارش میں بھیگتا چلا گیا۔

دیوارگھری شام کے سات بجا رہی تھی۔ اس دنیا میں ہر تحرک  
بجز سہیہ کئے لئے یا تھوڑی دیر کئے رکھا جاتی ہے۔ مگر وقت کے  
پاؤں کہیں نہیں رکھتے۔ کچھوے کی چال سے آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔  
دیوارگھری رات کے دس بجائز لگی۔ خوابگاہ کا ماحول سگریٹ  
کے دھوپیں سے آلو دھپور ہاتھا۔ آصف بے چینی سے ٹہلتے ہوتے سگریٹ  
کے کش لگا رہا تھا۔ ایش ٹرے میں بھرے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹے  
انتظار کی طوالت ظاہر کر رہے تھے۔ پھر اچانک ہی باہر ایک گاڑی کی  
آواز آئی۔ وہ نیزی سے چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

کھڑکی کے باہر بارش ہو رہی تھی۔ احاطے کے گیٹ کے باہر  
ایک عودت رکشا سے اُتر کر کراپہ ادا کر رہی تھی۔ وہ بوی ہی تھی۔ مگر نہم تاریکی  
اور بارش کی دھنڈ میں پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اب وہ احاطے کا گیٹ کھول کر

اندر آ رہی تھی ۔ آ صف کھڑکی کے پاس سے پلٹ کر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا خواب گاہ سے باہر جانے لگا۔

وہ ڈرائیور میں آیا۔ وہاں سے گزرتا ہوا  
بیرونی دروازے پر پہنچا۔ پھر اس نے دروازے کی چینخی گرا کر اسے ایک  
جھٹکے سے کھولا۔ اسی لمحے بجلی زور دار آواز کے ساتھ کونڈنے لگی۔ وہ بارش میں  
بھیگ کھڑی تھی ۔ بال بھرے ہوتے تھے چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں سے  
گہرے صدیے کا الہما رہور ہاتھا۔ اور وہ آگے بڑھنے سے ہچکپا رہی تھی۔

”بوبی ۔“ آ صف نے بڑے پیار سے مخاطب کیا۔

بوبی نے سراہا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ آ صف  
نے سنجیدگی سے اپنے دونوں بازوں پہنچلا دیئے۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی پھر  
اس کے گلے لگ کر بے اختیار رد نہ اگی۔ آ صف نے پچکارتے ہوئے  
پوچھا۔

”کہاں رہ گئی تھیں ۔؟“ میر انتظار کرتے کرتے گھر آ گیا تھا۔

”میں ۔ میں تمہارے لئے تحفہ خریدنے کی تھی ۔“

”اوہ موٹرسائیکل ۔؟“

”میں ۔ میں وجید کے ساتھ گئی تھی ۔ ہم موٹرسائیکل سے گر  
پڑتھے ۔“

”تمہیں چوٹ تو نہیں آتی ۔؟“

”چوٹ ۔؟“ بجلی ایک بار بعد کوئندگئی ۔ ”نہ ۔ نہیں۔ میں بالکل بھیک

ہوں — !

"تم نے دحید اور موڑساٹیکل کو کہاں چھوڑ دیا؟"

بوبی اب ذرا ہمچکی پائی۔ اسے چشم تصور میں وہ جھگی نظر آنے لگی۔  
جھگی کا بوڑھلاک بوبی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا تھا۔  
بیٹی ! آنسو پونچھ لو۔ اس بات کو جھگی میں ہی دفن کر دو۔ اگر تم  
اپنے شوہر سے شکایت کر دگی تو وہ غیرت کے جوش میں اس بدمعاشر کو  
قتل کر دے گا۔ اور قتل کی سزا پھانسی ہوتی ہے۔  
بوبی بھر اکرنے میں سنبھالنے لگی۔  
آصف نے پوچھا۔

"یہ سرپلانے کا مطلب کیا ہوا؟"

"آل — وہ موڑساٹیکل خراب ہو گئی۔ دحید ہر ساتھ  
آ رہا تھا۔ پھر وہ گلبرگ میں اتر گیا۔"

"بڑا بیہودہ ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ تمہیں یہاں پہنچا کر جاتا۔  
بہرحال میں خدا کا شکر ادا کرنا ہوں کہ تم بخیریت عزّت دا آبرد سے یہاں پہنچ  
گئیں۔"

بھلی پھر ایک ہار شور جما کر خاموش ہو گئی۔

۲۱۷

جھگی کا بوڑھا مالک ایک پیالی میں چانے یا کر جوگی کے باہر آیا۔ پھر موڑ سائیکل کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔  
”صاحبی! گاڑی شہیک ہو گئی۔؟“  
آصف نے گاڑی کی سیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔  
”ہاں بابا! بالکل شہیک ہو گئی۔“  
بابا نے چانے کی پیالی بڑھادی۔ آصف نے قبول کرتے ہوئے کہا۔  
”آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا؟“  
”تکلف نہیں۔ غریب کی خوشی ہے بیٹا... بوبی بیٹیا خیریت سے ہے نا۔؟“  
”جی بابا۔ آپ اسے پناہ نہ دیتے تو شاید وہ خیریت سے لگر نہ پہنچ سکتی۔“

”خدا اسے عزت دا برو سے رکھے۔ ایک بات کہوں بیٹا۔!  
بُرا تو نہیں مانوگے۔؟“

وہ پیاری دالپس کرتا ہوا بولا۔

”میں بزرگوں کی عزت کرتا ہوں۔ آپ فرمائیں۔؟“

”بیٹا! یہ تمہاری نئی تہذیب کچھ اچھی نہیں ہے۔“

دہ مسکرا کر موڑ سائیکل پر رکھتے ہوئے بولा۔

”پہ آپ کو سُری کیوں لگی۔؟“

”بس یوہی — اپنی بیوی کو آئی ددد دستوں کے ساتھ سیر و تفریغ  
کی اجازت دینا۔۔۔۔“

آصف نے چونک کر بوڑھے کو سوالیہ نظرؤں سے دیکھا۔ بوڑھا جلدی سے بولا۔

”بوبی بہت اچھی ہے۔ نیک اور پارس ہے۔ مگر دوست اچھے نہ ہوں تو بدنامی کا باعث بن جاتے ہیں؟“

”میاں بھی کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہوتا ہے۔ اعتماد مذکور ہے تو پھر  
کہنے والے مدت قابل نظر ہوئے اس کا تابع ہے۔“

کچھ نہیں رہتا۔ میں دوستوں پر نہیں اپنی بیوی پر اعتماد کرتا ہوں:-  
اس نے ایک جنکے سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پھر جگی تے دور  
ہوتا چلا گیا۔

انجمن نے ریور اٹھا کر نہر ڈال کئے۔ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر انتظار کرنے لگی۔ دوسری طرف سے آداز آئی۔

"ہیلو۔!"

وہ مسکرا کر بولی۔

"ہیلو آصف! کیا اب تک ناراض ہو۔؟"

آصف اپنے دفتر میں بیٹھا میز پر پھیلے ہونے اخبار کو دیکھ رہا تھا۔ اور ریور کان سے لگائے بول رہا تھا۔

"میں ناراض نہیں مصروف ہوں۔"

"جبوٹ بول رہے ہو۔ سارا کام تمہارے ماتحت کرتے ہیں۔"

حکم دو تو ابھی آجائیں۔!"

"نہیں انجمن۔! دوستی کی ایک حد ہوتی ہے۔" وہ اخبار کے ایک

کالم پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

”میں دعوہ کرتی ہوں اس حد سے آگے نہیں بڑھوں گی۔“

”نہیں۔ اب یہ سلسلہ ختم کرد۔ آج میں بوبی کو تباہوں گا کہ میں نے اس کی تسلی کے لئے جھوٹی روپورٹ دکھائی تھی۔ میں پاپ نہیں بن سکتا۔“

”تم حماقت کرو گے۔!“

آصف کی انگلی اخبار کے کالم کے ایک حصے پر رک گئی۔ وہ خوش بخوبی تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

”دیل ڈن۔ بوبی پاس ہو گئی۔“

”کیا ہو گئی۔؟“ انجم نے پوچھا۔

آصف ریپورٹ کو کر خوشی سے مشکراتا ہوا اخبار ہاتھ میں لیکر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر جیسے اُسے پر لگتے۔ وہ دفتر سے باہر آیا۔ عمارت سے باہر آیا۔ اپنی موٹر سائیکل استارٹ کی ناصیلے کبھی کبھی یوں بھی سمرٹ جاتے ہیں۔ ادھر گاڑی استارٹ ہونی انھر ان پے گھر کے دروازے پر ہیٹھ گئی۔ اس نے خوشی سے جھوشنے ہوئے مکان میں داخل ہوئے ہو۔ نہ آواز دی۔

”میری جان! کہاں ہو؟ آذ میں تمہیں گلنے لگا کرا متحان میں کامیاب ہونے کی خوشخبری سناؤ۔“

وہ ڈرائیور میں سے گزرتا ہوا خواب کاہ کے دروازے پر آیا۔

پھر ایک دم سے سُمُّہک گیا۔

بوبی پانچھروم میں والش بین پر جھکی ہوئی تھی۔ اسے ایکائیا  
آرہی تھیں اور ایکائیوں کی آوازیں آصف تک پہنچ رہی تھیں۔

اچانک اس کی سماعت میں گلننا ہیں لہر لئے لگیں۔ بوی گلنگانی  
ہوئی پوچھ رہی تھی۔

”میرے محبوب! مجھے تبا۔ میرے سونے آنکن میں تیری چاندنی کب  
کھلے گی۔ . . . ؟“

آصف پریشان ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پانچھروم سے بوی  
کی کراہتی ہوتی سانسیں سنائی دیے رہی تھیں۔ کمرے میں پیچ کی تصویر  
مسکار رہی تھی۔

آصف کو وہ دن یاد آیا۔ ببپ ہسپتال میں انجمن سے پہلی ملاقات  
ہوئی تھی۔ انجمن نے اس سے کہا تھا۔

”تمہیں اپنا چیک آپ کرنا چاہیے۔ چپلو میں تمہیں ڈاکٹر  
زیری سے ملا دیتی ہوں۔“

انجمن کی دوسری بات یاد آئی۔

”اگر تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ تمہارے گھر میں کوئی چور دروازہ بھی  
ہے تو کوئی بھی اپنے گھر کا چڑا اس چور دروازے کے راستے تمہارے گھر  
میں پھینک سکتا ہے۔“

انجمن کی ثیسروی بات یاد آئی۔

”جو لوگ اپنی خامیوں کا حساب نہیں رکھتے۔ دوسرے لوگ ان خامیوں سے نائدہ الحاصل ہیتے ہیں۔“  
آصف کو ایک جھٹکا سالگا۔ اس کے کانوں میں آوازیں گونجنے لگیں  
”کچرا۔۔۔ کچرا۔۔۔ کچرا۔۔۔“  
ہر آواز کے ساتھ بچے کی مسکراتی ہوتی تصویریں گاہوں کے سامنے آنے لگیں۔

بوبی دروازے کو تھام کر راتھ روہم سے باہر آتی۔ آصف کو دیکھ کر ایک دم سے خوش ہرگئی۔

”آصف! میں۔۔۔ میں۔۔۔“  
آصف نے اسے گھوڑ کر دیکھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں دہ شرماتی ہوتی بولی۔  
”بچھے شرم آتی ہے۔ انجمن کو بلاؤ۔ دہ بچھے دیکھنے کے بعد تمہیں بتائے گی۔“

دہ تیز سے پلٹ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔



”نجمن کے کرے میں نون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے رسیور  
اٹھا کر کہا۔

”ہیلو... اد د آصف! آخر میں یاد آگئی نا؟ ہاں... اچھا لو  
تھہاری باتیں سن رہی ہوں۔ بولو۔“  
وہ نہنے لگی۔ بھپڑچرانی سے بولی۔

”کیا کہا۔؟ بوبی ماں بننے والی ہے۔؟ اٹ از کو اٹ اپ سیبل۔“  
انجمن نے یہ سمجھتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے وحید کو دیکھا۔ وہ  
جلدی سے اٹھ کر جانے لگا۔ انجمن نے ”ایک منٹ“ کہہ کر رسیور  
کے ماڈم تھہیس پر پرانہ رکھ کر بولی۔

”بھائی جان ٹھہر جا یئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ نے ایک  
باد کھا تھا کہ آصف باپ نہیں بن سکے گا۔ یہ کن بوبی ماں بنے گی۔ کیسے؟“

وہ لاپرواٹی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے نشے کی حالت میں پیش گئی کی تھی سمجھ کیا معاجم تھا کہ رہ پیش گوئی پر ثابت ہوگی۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں آپ بہت کچھ دیانت پڑھیا۔"  
کوئی شخص کچھ نہیں جانتا۔ جب تک عورت انہیں فرماتی۔ اگر اس کے پچھے کا باپ کون ہے؟ اور یہ بیوی اتنا بتا سکتی۔ ہے....."

یر کھکھر دہ چلا گیا۔ اس بھن ریسیور کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

"ہمیز آصف۔ میں ابھی بویا کو چیک کرنے آرہی ہوں...  
اس نے ریسیور لکھ دیا۔ سچھ میز پر سے دو ایکس کو بیٹھا کر جانے لگی۔

بپڑ

آصف اپنے مکان کے باہر خواب گاہ کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا  
سن رہا تھا۔ اندر سے انجمن کی آواز آرہی تھی۔

”ہال۔ شیک ہے۔ سیدھی لیٹی رہو۔ کب سے بیہت  
ہے۔“

بوپی کی آواز سخائی دی۔

”بس آج ہی دوبار متسلی ہوئی۔ اچار کھانے سے آرام آیا۔۔۔“  
آصف کے چہرے سے ایسا کرب ظاہر ہوا تھا جیسے اس کے  
دماغ پر ستھر لے برسا رہے ہوں۔  
بوپی نے کہا۔

”انجمن! آصف کے سامنے کہتے مجھ شر آرہی ہے۔۔۔ اس لئے  
میں نے تمہیں بلا بیا ہے۔۔۔ دیسے تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں سمجھ گئی۔

”نہیں۔ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ غلط نہیں ہو سکتی۔“  
انجمن کا ملکہ کا ساطھ سنائی دیا۔

”ہاں۔ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ.... غلط نہیں ہو سکتی۔“  
بوبی نے پوچھا۔

”آصف کہاں ہیں۔؟“

”پر نہیں۔ مجھے کہیں سے فون کیا تھا۔ میں سمجھی یہاں موجود  
ہوں گے۔؟“

آصف کھڑکی کے پاس سے چلا گیا۔  
بوبی نے کہا۔

”تعجب ہے۔ کہاں چلے گئے۔؟“  
انجمن نے کہا۔

”اچھا۔ اب میں جاتی ہوں۔ آصف آتے تو کہنا مجھے فون  
کر لے۔؟“

وہ بیگ اٹھا کر باہر آئی۔ احاطہ کے باہر اس کی کار کھڑی ہوئی  
تھی۔ جب اس نے قریب آ کر کار کا درد ازہ کھولا تو اگلی سیٹ پر آصف  
بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ بیگ کو سچھلی سیٹ پر رکھ کر اسٹینٹنگ سیٹ  
پر بیٹھ گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ کار استارٹ ہو کر آگے ٹڑھ گئی۔  
ڈرامیونگ کے عوران انجمن نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا  
پھر سنجیدگی سے کہا۔

"میں تمہارے دلکھ کو سمجھ رہی ہوں؟"

وہ چپ رہا۔ تھوڑی دیر تک خالشی رہی۔ پھر انجمن نے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا دلکھ کیسے بانٹ سکتی ہوں۔؟"

"جگہ سے ایک نیک اور کرو۔۔۔ اپنی جھوٹی رپورٹ پر قائم رہو۔ دنیا بھی سمجھ کر وہ بچھ۔۔۔ پڑیں ہے۔۔۔"

انجمن گاڑی ایک ہنرف رکھ کر جو رانی سے ائے دیکھنے لگی۔ پھر اخوندی۔

"تو بوبی کو اب بھی چاہتے ہوئے؟"

"شاپریز میری چاہتی ہو۔۔۔ لیکن میں بوبی کی محنت اسے انھیں ازدراوات اہم ہوں۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"دیکھو، میں باپ نہیں بن سکتا۔۔۔ مجھے چاہتے تھا کہ میں ابی رکھ رکھ دیتا۔ لیکن ابی مجھے نہ رکھ رکھتی۔۔۔ ہماری سوسائٹی میں ایک شوہر کو تھوڑ کر دوسرا شوہر کرنے والی عورت انظر وال سے گرجاتی ہے۔۔۔ مرد بھی پیٹک سمجھتا ہے۔۔۔ اسے اولاد نہ دینے کے باوجود اس کا جوانی خدا بیکھر دینا چاہتی ہے۔۔۔ شادی کے بعد چار سال تک ہم ایک دوسرے کو بہادر تھے۔۔۔ آخوندی اپنی مامتا کے ہاتھوں ہار گئی۔۔۔ اس نے بچھ کیا اس میں میری خامیاں بھی شامل ہیں۔۔۔"

"میں تپڑا باتیں سمجھو۔۔۔ ہا ہا۔۔۔ مگر اس بچے کو تمہارا نام نہیں مل سکتا۔۔۔"

"تمہاری جھوٹی بابری کے مطابق میں باپ بن سکتا ہوں۔ اگر تم رازدار نہ کر دے ہے کا وعدہ کرو تو بوبی کی عزت درہ جانتے گی۔ مہتاب اس پر پورا ہو جاتے گا۔ اور اس کے سچے نویں نام مل جانتے گا۔"

"تم نے بوبی کی محنتا اور بجبور بیان تو سمجھ دیا کیا اسے تمہارے دلکش کا احساس ہو گا۔؟"

"میر نادان تھا۔ اب تک پیار کے بڑے پیار چاہتا تھا۔ اب تھا دور چلا جیسا قہر مگار اس کی یاد میں بھی مُستی چلی جائیں گی۔"

امحمد نے اس کے ہاتھ پر زندگی کر کر کھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چاہوں گی۔"

وہ اپنا ہاتھ ٹھہر کر نواز۔

"نہیں۔ اب میر دوسرے ملکی نہیں کر دیں گا۔"

"غلطی شہزادی نہیں بوبی ہی ہے۔ اور دنیا کی ہر عورت بوبی نہیں ہو سکتی۔"

"میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ خدیدہ کرو۔ میں ایسا چاہوں گا کہ تم بھی مجھے ڈھونڈ نہیں سکو گی۔"

وہ ایک گھری سالنس لیکسٹری۔

"اچھی بات ہے۔ تم میری قدر نہ کرو۔ مگر میں اپنے حق کی دنیا بچاہوں گی۔ میں تمہیں انساچاہی کی مہول۔ انساچاہی ہوں کہ تمہیں دھوکہ دینے والی عورت کو معاف نہیں کر دیں گی۔"

آصف پریشان ہو کر اسے سوالیہ نظر دیں سے دیکھ دے لے گا۔

"تم مجھ سے نظرت کرو۔ میں بوبی سے نظرت کر دیں گی۔ اگر تم اسے  
میرے انتقام سے بچانا چاہتے ہو تو مجھے ساتھ لے چلو۔"

آصف نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو قفل میا۔ ان جن نے اس کا ایک  
ہاتھ تھام کر کر ہوا۔

"جب تک ہمارا شتر مفہوم طور پر ہے گا۔ بوبی اور اس کے بچے کو تمہارا  
نام ملتار ہے گا۔"

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آصف کے دفتر کا چہرائی اھاطے کا گینڈ کھول کر انہوں نے آیا۔ پھر مکاں کے دروازے پر دستک دیئے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بوبی نے دروازہ کھول کر اسے دیکھتے ہوئے پڑھا۔

"تم۔؟ صاحب کہاں ہیں۔؟"

"پتہ نہیں۔ انہوں نے یہ خط دیا ہے۔"

اس نے ایک لفافہ دیا۔ بوبی اسے لیکر سوچتی ہوئی نظر دل سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے لفافہ سے خط انکاں کر پڑھنا شروع کر دیا۔ لکھا تھا۔

"بوبی! میاں بیوی کے سپنے الگ الگ نہیں ہوتے  
ہمارے سپنے سب اپنے ہوتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی تعبیر بدل جاتی  
ہے۔ اپنے سپنے کا تعبیر تم ہی بتا سکتی ہو۔ مگر تم سے پہلے ڈاکٹر

زیدی نے بتا دیا تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں مبارکباد دینے نہ آسکا  
اچانک بہت بڑا بڑا مل گیا ہے۔ لاکھوں روپے کا منافع ہے  
اس لئے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ شاید مک سے باہر بھی جانا  
پڑے۔ میری فکر نہ کرو۔ تمہارا دل بہلا نے کہا تو وہ بھت  
کافی ہے۔ فقط۔

### آصف:

بوبی نے لفاف سے ایک چیک نکالا۔ وہ بھروسہ میزارہ پر  
کاچیک تھا۔ اس نے چراسم سے پوچھا۔

”کیا اندازہ کو اتنی جلدی تھی کہ وہ یہاں لاگر انپاس امان بھی نہیں لے گئے؟“  
”نہیں۔ یہ گم تھا جبکہ شاید انہیں سامان لکھا کر درست نہ ہو کیونکہ  
وہ بڑے تڑے نرٹوں کی گذیاں برلف کیں میں رکھ کر لے گئے ہیں۔“  
”انہیں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ شہر سے باہر کہاں گئے ہیں؟“  
”جب آپ کو نہیں بتایا تو مجھے کیا بتاتے۔ میں تو نوکر ہوں۔“

بوبی کا چہرہ بچھوڑا گیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ چپراسی سلام  
کر کے واپس چلا گیا۔ وہ ددرازہ بند کرنے کے بعد بوجھل تدوالی سے  
چلتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں آئی۔ اس کے چہرے سے جھراہٹ اور  
پریشانی عیاں تھی۔ لیکن جب اس نے سرا شما کر بیکی کی تصویر کو دیکھا تو اسے  
مسکراتے دیکھ کر بے اختیار چیکی سی مسکراتا۔ اس کے ہوں پڑا گئی۔

پھر وقت گزر نے لگا۔ وہ راتیں کر دیں بدل کر گزار نے لگی۔ وہ ایسے مقامات پر جاتی، جہاں وہ آصف کے ساتھ کبھی دفت گزار جکی تھی۔ کبھی ڈاکنے سے پوچھتی کر اس کے نام کوئی خطا آیا ہے؟ دفتر کے منجر نے بتایا۔ ”آصف صاحب کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اب تک ایک خط بھی نہیں آیا ہے۔“ وہ ہسپتال میں گئی۔ وہاں انہیں کی جگہ دوسری لیڈی ڈاکٹر سمیٹی ہوتی تھی۔ اس نے بوبی سے کہا۔

”ہاں؟ مجھ سے پہلے ایک لیڈی ڈاکٹر انہیں نہیں۔ وہ استعفی دیکر چل گئیں۔ ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں اس کے بھائی کا میٹھیکل اسٹریڈ ہے آپ وہاں جا کر معلوم کریں۔“

میڈیکل اسٹریور کے ہاؤسٹر پر دیکھ دکھڑا سگریری میں سلکار رہا تھا۔ اس نے ایک کش لیکر دھواں چھوڑنے کے بعد بوبی سے کہا۔

”تمہیں اسی دن میرے پاس آنا چاہیئے تھا۔ جب آصف۔ تمہرے چھوڑ گبا تھا۔ کیونکہ اب میں ہی تمہارا سہارا ہوں۔“

”میکو اس مت کرو۔ مجھے بناؤ انہیں کہاں ہے؟“

”وہ بھی اسی دن اپاڑنے کا سب ہو گئی۔ سناید بہت دنوں سے ناشب ہونے کا چکر چل رہا تھا۔!“

”تمہیں اپنی بیوی کے پارے میں ایسی بات سمجھتے شرم نہیں آئی۔“

”شرم کیسی۔ آصف پر پہلا حق اس کا تھا۔ پہلی محبت ہمیشہ رنگ لاتی ہے۔ جیسے ہماری محبت رنگ لا رہی ہے۔“

کیا مطلب ۔ ۔ ۔؟" وہ گھوڑ کر دلی ۔ "شاید تم کسی خوش فہمی میں متلا  
ہو۔ میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

وہ غصے سے پدٹ کر دہال سے جانے لگی۔ مگر غصے سے زیاد و غم اسے  
نڈھال کر دے ہاتھا۔ وجہ کی باتیں سچوں کے لگارہی تھیں کہ انہیں بھی اسی دن  
اچانک غائب ہرگئی۔ شاید بہت دنوں سے غائب ہونے کا چیز چل  
رہا تھا۔

وہ ہپنال کی کپاڈ نڈوال کا سہارا لیکر کھردی ہرگئی۔ پھر آنسو بھرے  
لہجے میں اسنے آواز دی ۔ "آصف...."

ب

آصف کے ہوشیوں پر لرزش پیدا ہوئی۔ ہوشیوں سے آواز نہیں نکلی۔ لیکن ان کی جیش سے صاف تپہ چل رہا تھا کہ وہ بولی کا نام لے رہا ہے۔ انہم نے اسے گھری سنجیدگی سے دیکھا۔ وہ بیمار پڑا ہوا تھا۔ اس کی دارجی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر پیشانی جملک رہی تھی۔ دیوار پر لگا ہوا کلیدر تباہ ہتا کر ایک برس گور جگپا ہے۔ انہم نے اس کا سر سہلا تے ہوتے کھا۔

“آصف! آنکھیں کھولو۔ دوایپی لو۔”

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر انہم کے سہارے اٹھ کر دوا پینے لگا۔ اس کے بعد یستے ہوتے بولا۔

“تم میرے لئے اپنا وقت برداذ کر رہی ہو۔”

“بیماری میں زیادہ نہیں بولتے۔ اب چپ چاپ سو جاؤ۔”

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس نے ددبارہ آنکھ کھولی تو انجمن کا بیاس بدلنا ہوا تھا۔ وہ اس کے بازو میں انگکشن لگا رہی تھی۔ سامنے دیوار پر لگی ہوئی تصویر میں سورج غروب ہوا تھا۔

انجمن نے کھڑکی کا پردہ ایک طرف ہٹا دیا۔ صبح بیکی تھی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ کبھی اندر ہمہ را ہوتا تھا۔ کبھی اُجala۔ آصف کبھی متنا تھا اور کبھی جاگتا تھا۔ مگر انجمن ہمیشہ جاگتی نظر آتی۔

پھر ایک بار آصف کی آنکھ مکھلی تو انجمن اس کے سینے پر پردہ کھے سورہی تھی۔ اس کے خوابیدہ چہرے پر موصیبیت تھی۔ کئی دنوں اور کئی راتوں کی تھکن کے آثار تھے۔ آصف اسے دیکھتے ہوئے ہمدردی اور احسانندی سے سوچنے لگا۔ وہ سوچتے سوچتے ابھرنا تھا۔

دوسری صبح نہ لبتر پر بیٹھا ہوا تھا۔ انجمن ایک پیالہ اوڑھچ گئے اسے کچھ کھلا رہی تھی۔ آصف نے اس کا ہاتھ تھام کر کھا۔

”اب میں اپنے ہاتھ سے کھا سکتا ہوں۔“

انجمن نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیکھ کر کھا۔

”کبھی میں بھی ڈکھ موصیبیت میں مُبتلا ہو سکتی ہوں۔ کبھی مجھے بھی تمہارے ہاتھ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”آں۔۔۔؟“ آصف نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

”میں کچھ نہیں چاہتی۔ بس مجھے اپنے حصے کی دفائی بھالئے دو۔“

”ایک برس گزہ چکا ہے۔ آخر تم کب تک میرے ساتھ رہو گی؟“

”جب تک تم یہ نہ سمجھ لو کہ ہر عورت بے دفان ہیں ہوتی۔“

”میں سمجھتا ہوں۔ پھر بھی کسی کی بے دفانی نے میرے اعتناد کو غاک

میں علاج دیا ہے۔“

”تم ایک کی سزا دہری کو نہیں دے سکتے۔ اعتناد بحال کرنے کی تدبیر ہو سکتی ہے۔“

”کیسی تدبیر۔؟“

”تم مجھ پر آزمائشی اعتناد کرو۔ اگر کبھی تمہارے اعتناد کو مجھ سے لٹھیں پہنچے تو مجھے بھی شکر اکر جلے جانا۔ یہیں اُت نہیں کروں گی۔“

آصف نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں پیار لئے کھڑی تھی۔ پیارے کو اس کی طرف بڑھاتی ہوتی بولی۔

”صرف ایک بار۔ مجھے ایک بار آزمائو۔۔۔“

آصف کے درستہ چلتے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھتے۔ پیارے کی طرف آتے۔ پھر ان ہاتھوں نے انہیں کہے اُنہوں سمیت پیارے کو تھام لیا۔

انہیں کی سماعت میں شہنازیاں گوشہ رہی تھیں۔

دلا دلہن بنی گھونگھٹ نکالے سہاگ کی سیع پر بیٹھی ہوتی تھی۔ اس نے گھونگھٹ کی اڈت سے دیکھا۔ دلہا کے پاؤں قایین پر آہستہ آہستہ بڑھتے آ رہے ہیں۔ وہ حیا سے سکھنے لگی۔

آصف سیع کے قریب آ کر رک گیا۔ دلہن کو دیکھنے لگا۔ چشم تصور میں بولی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ آصف کا چہرہ ایک دم سے مر جا گیا۔ وہ پلت کر جانے لگا۔ دلہن نے ہاتھ تھام لیا۔

اس نے پلت کر دیکھا۔ انہم دلہن بنی اسے الجا آمیز نظر سے دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ”مجھے افسوس ہے۔ میں نے اس کا سایہ دیکھا تھا۔“

”میں سایہ نہیں۔ تمام عمر کی ساتھی ہوں۔“

آصف بن اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ انہم

نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے اندر پیار کے کتنے ہی گیت مچل رہے تھے۔ آصف اس کے چہرے پر جھجک رہا تھا۔ اس کی بند پلکوں پر سمجھی ہوئی افشاں جگہ گمارہ ہی تھی۔  
کہیں گیت۔ کہیں نوحہ۔۔۔۔

بوبی کی بند پلکوں پر آنسوؤں کی بوندیں جمگانہ گمارہ ہی تھیں۔ اس کے اندر دھوڑتا ہو ادل نوحر کناں تھا۔ وہ لستر پر لٹی ایک ڈور کو تھامے پالنے کو ہلا رہی تھی۔ بوبی کی گود خالی تھی۔ پالنے کی گود میں ایک بے جان گزر یا سور ہی تھی۔

دیوار پر لگی ہوئی بیچے کی مسکراتی ہوئی تصویر اچانک اپنی جگہ چھوڑ کر فرش پر گر پڑی۔

کہیں خداں کہیں بہار۔۔۔۔

آصف اند انہ بن پہاڑی مقام پری ہر یا یوں میں گھوم رہے تھے زندگی کی گود میں بھول بھول کھلے ہوئے تھے۔ سات رنگوں کی دھنک ان کے دلوں میں اُتر رہی تھی۔ کبھی وہ پیک ڈرام میں بیٹھے بلند یوں سے گزر رہے تھے۔ کبھی پتیوں میں شانگ کر رہے تھے۔ زندگی کے سہنے بولنے گیت ان کے ساتھ ساتھ روای دواں تھے۔

کبھی قہقہے، کبھی آنسو۔۔۔۔

بوبی گرڈیا کو سینے سے لگائے آنسو بھری آنکھوں سے کھڑکی کے پار  
دیکھ رہی تھی۔ باہر لان میں خداں رسیدہ پتے اپنے دھر اڑاتے  
ہوتے، بہکتے ہوتے یوں شور مچا رہے تھے جیسے کوئی ماننی را گئے سنائے  
ہوں۔ شوکیں میں سمجھے ہوئے کھلوٹے اداں تھے۔ بوبی گرڈیا کو  
سینے سے لگائے آپستہ آپستہ بتر کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ بتر کے  
سر ہائے والی میز پر آصف کا تصویر مسکرا رہی تھی۔

پھر اسے دروازے پر دستک سنائی دی۔ بوبی نے چونک کر  
تصویر کو دیکھا۔ پھر دوسری طرف جیسے دروازے کو دیکھا۔ دستک پھر  
سنائی دی۔ پہلے رہ زیرِ اسبابوی  
”آصف۔“

دستک پھر سنائی دی۔ پھر وہ آصف کا نام لیکر جھوٹی ہوتی اٹھا کر  
بھاگی۔ درڑتی ہوئی ڈرائیگ رومن میں آئی۔ دہاں سے دوڑتی ہوتی  
راہداری میں ہنچی۔ پھر آصف کوئی ہوتی ایک سجنک سے دروازہ کھولیا۔  
دروازے پر وجید مسکراتے ہوتے کھرد رہا تھا۔

”ہاتھے روی محبت! اب بھی اسی کے نام سے دروازہ کھلتا ہے۔“  
وہ دروازہ بند کرنے لگی۔ وجید نے رکتے ہوئے کہا۔

”خُبْر! آصف کا سراغ مل گیا ہے۔ میں اس کا ایڈر لیں لایا ہوں۔“  
وہ جیب سے خط نکالنے لگا۔ بوبی نے بے نابی سے پوچھا۔

”آصف نے مجھے خط لکھا ہے۔؟“

”نہیں۔ انہیں نے مجھے لکھا ہے۔ وہ آصف کی فریک  
حیات بن چکی ہے۔“  
وہ پیغام کربولی

”یہ جھوٹ ہے۔!“  
اس نے لفاذ آگے بڑھا کر کہا۔

”یہ سچ ہے۔ اس خط میں ان کا پتہ موجود ہے۔“  
بوپی نے کاپتے ہوئے ہاتھ سے اس خط کو لیا۔ وجہ نہ کہا۔

”میں یہ خوشخبری سنانے اس لئے آیا ہوں کہ اب تم میری بہن  
کے راستے کی دیوار نہیں بن سکوگی۔ اب تمہارے سامنے یہی ایک  
راستہ ہے کہ انہیں کو مبارکباد دو اور آصف پر لعنت بھجو اور میری  
حصہوں میں آجائی۔!“

”گیٹ آؤٹ۔!“ بوپی نے چھٹتے ہوئے دروازے کو بند  
کر دیا۔ پھر وہ لطفے کو ایسی سہی ہوتی نظر دی۔ سے دیکھنے لگی جیسے وہ  
موت کا پروانہ ہو۔!

اسے وہ دن یاد آنے لگا۔ جب وہ موڑ سائیکل پر آصف  
کے پیچھے بیٹھی دوسرا شادی کے سلسلے میں بحث کر رہی تھی۔  
بوپی نے کہا تھا۔

”شاید سہارے ستارے آپ میں نہیں ملتے۔ اگر آپ  
دوسری شادی کر لیں تو باپ بننے کی خواہش پوری ہر جائے گی۔“

آصف نے پوچھا۔

"اور دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوتے؟"

"ضرور ہوگی۔" "دہ منہ پھیر کر دل پر جبرا کرنی ہوتی بولی" آپ دوسری شاری کر لیں۔

بوبی کی چشم تصور میں منظر بدلتا۔

آصف اپنے دوستوں کے درمیان سہاگ کے جوڑے میں پہنچی ہوئی دلہن کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور آواز دے رہا تھا۔

"بوبی تم کہاں ہو؟ دیکھو میں نے دعہ پورا کر دیا ہے۔ دوسری گھردالی لئے آیا ہوں۔"

چشم تصور کے مناظر ختم ہو گئے۔

بوبی بند دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ کھلا ہوا خطا اس کے پانھوں سے چھوٹ کر راہداری کی محدود فضامیں کٹی پنگ کی طرح ڈول رہا تھا۔



کٹی ہوتی پنگ کھلی فضامیں ڈلتی ہوتی آصف کی طرف آرہی تھی۔ بچے سورج مچا رہے تھے۔ دہ کوٹھی کے دروازے کی طرف جاتے جانے رک گیا۔ سرپر سے گزرنے والی پنگ کو ہاتھ پڑھا کر تھام لیا۔ اسی وقت بچوں نے اس کے آس پاس آکر سورج مچانا شروع کر دیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سب سے چھوٹے بچے کے ہاتھ میں پنگ دے دی۔  
ڈاکتے کی آواز آتی۔

”آپ کا خط....“

اس نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے ڈاکتے سے خط لیا۔ مگر لفافے کے ایک طرف نظر پڑتے ہی اس کی مسکراتہ کا فور ہرگئی۔ وہ بڑھا یا۔  
”بوبی...“

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اضطراری حالت میں اس کی مٹھی لفافے کو بھینچ رہی تھی۔ پھر فتہ رفتہ وہ مٹھی کھلنے لگی۔ انگلیاں لفافے کو چاک کرنے لگیں۔ ابک تہہ کیا ہوا کاغذ نکلا۔ پھر آصف کے دونوں ہاتھوں میں وہ کاغذ کھل گیا۔ بوپی اس کے کانوں میں بولنے لگی۔

”آصف! میں اتنک نہ سمجھ سکی کہ تم نیری کو سناتھی کی سزا میں دے رہے ہو۔ دوسری شادی کی خوشی میں ہی سیراجرم تباہ دے۔ اگر میراجم ثابت ہو جائے تو میں تمہارے قدموں میں ٹکر کر روانی مانگ لوں گی۔ اور اگر بے جرم سزا میں دے رہے ہو تو تمہارا ظلم تمہیں مبارک میں کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھوں گی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھے سیرجی غلطی تباہ دو۔!

فقط تمہاری اور صرف تمہاری بوپی:

اس نے خط کو دو باہہ مٹھی میں بھینچ لیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے در دازے سے اندر گیا۔ دہان بہنچ کر اس نے آواز دی۔ ”انجم! یہ دیکھو بوپی کا خط آیا ہے۔ ڈھنڈتی کی حد ہوتی ہے وہ پوچھ رہی ہے کہ اس کا گناہ کیا ہے۔؟“ انجم ڈرائیگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھی پریشان نظر وی سے۔ ”مخفہ کو دیکھو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اب میں اسے لکھوں گا۔ اسے بتاؤں گا۔ مکار عورت! میں نے تیری شرم رکھنے کے لئے تیرے گناہ کا حساب نہیں کیا تھا۔ تیری تسلی کے لئے تھے ایک جھوٹی روپورٹ، دکھائی تھی۔ اب تک میں نے تیری مفتا کا بھرم رکھا۔ تیرے بچے کو اپنا نام دیا۔ مگر اب نہیں دوں گا۔ اس لئے آج میں باپ نہیں ہوں۔ میں باپ نہیں بن سکتا۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔۔۔؟"

اس نے انجمن سے پوچھا۔ دہ گھم ستم بیجی ہوئی تھی۔ کچھ کہنے کے لئے اس کے ہونٹ کھلانا چاہتے تھے۔ مگر وہ ہونٹوں کو سختی سے بیٹھ رہی تھی۔ آصفہ نے قررے تعجب سے پوچھا۔

"تم خاموش کیوں ہو۔؟"

وہ چپ رہی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔؟"

"آں۔ دہ۔ دہ۔۔۔"

"ہاں۔ باں بولو۔!"

"دہ تم۔ تم باپ بن سکتے ہو۔!"

اس نے ہیرانی سے پوچھا۔

"کیا کہہ رہی ہو۔؟"

انجمن کا دایاں ہاتھ آہستہ پاس رکھی ہوئی تپائی پر گیا۔ تپائی ہد اچار رکھا ہوا تھا۔

آصف نے سنتے ہوئے کہا۔

"ارے! یہ تم اچار کیوں...؟"

یک بیک اس کے ذہن کو جھٹکا ساگا۔ وہ ایک قدم پیچے چلا گیا۔  
اس کی سماںت میں بوی کی آداز گو بنخنے لگی۔

"صبع سے دوبار متلی ہو چکی ہے۔ اچار کھانے سے آرام ہوتا ہے۔"

"نہیں...." آصف نے اتنی زور سے چیخ مار دی کہ انہیں اچھل

سکھڑی ہو گئی۔

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"تم جھوٹ کہہ رہی ہیں!"

"تمہاری قسم! پنج کہہ رہی ہوں۔"

"سکاٹ فریبی...." اس نے ایک زور کا طھانچہ رسپر کیا۔ وہ گھوم کر تپائی پر گری۔ پھر اچار کی پلیٹ کے ساتھ فرش پر پہنچ گئی۔

"آصف!" وہ پڑ کر اس کے قدموں سے پٹا گئی۔ میں اپنی جان دے سکتی ہوں مگر تمہیں دھوکہ نہیں دے سکتی۔ میں اس

معصوم بچے کی قسم کھاتی ہوں جو صرف میرا اور تمہارا ہے۔"

آصف نے اس کے باول کو مٹھی میں جکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے بوی کی شرم رکھ لی تھی۔ حد نہ اس کے سامنے جاتا تو وہ بھی اپنے بچے کی قسم کھا کر بھی کہتی۔ وہ اب بھی تمہاری طرح پارسا بن رہی ہے اور تم بھی ساری زندگی پارسا بن کر فریب دینا چاہتی ہو۔"

لدر ہو جاؤ میری نظر وں سے ....

اس نے اسے پھرے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی صوفی پر گرد پڑی  
چپر جلدی سے سراٹھا کر لی۔

"میری بات مان لو۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹری  
رپورٹ کبھی غلط بھی ہو سکتی ہے۔"  
اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"تمہارا وقت آیا تو رپورٹ غلط ہونے لگی۔ یہ بات تم بوبی کے  
وقت بھی کہہ سکتی تھیں۔ مگر نہیں۔ تم بھول رہی ہو۔ تم نے خود ڈاکٹر  
زیدی کی رپورٹ پڑھ کر سنائی تھی۔ میں رپورٹ کے ٹیکنیکل الفاظ اور  
ہند سے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ تم نے مجھے سمجھا یا تھا۔ کریسٹنگ رپورٹ  
کے مطابق میں کبھی باپ نہیں بن سکوں گا۔ کیا تم نے مجھے غلط سمجھا یا  
تھا؟ اگر تم مجھے اب فریب نہیں رہے رہی ہو، تو کیا اس وقت فریب  
دیا تھا؟"

وہ رو تے ہوئے انداز میں بولی۔

"میرا خدا جا مت لہے کہ میں اب بھی پس کچھ کہہ رہی ہوں۔ اور اس  
وقت بھی پس کچھ کہا تھا۔ یہ درست ہے کہ ڈاکٹر زیدی کی رپورٹ  
کے مطابق تم کبھی باپ نہیں بن سکتے۔ مگر بن رہے ہو۔ . . ."  
کیسے؟ وہ انجمن کا گلا دبو چنے کے انداز میں بولا۔ "مجھے  
ثبوت چاہتے ہیں۔ درخت میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ دیں گا۔"

انجمن کے دیرے چھیل گئے — اس کی آنکھوں کے ساتھ  
موت ناچ رہی تھی — وہ رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگی — آہستہ  
آہستہ اس کی گردن پر آصف کی گرفت رُ چھیلی پڑ گئی — وہ پیچے سپٹ  
کر انکار میں سر پلاتے ہوتے بولा۔

” نہیں — میں تمہیں نہیں ماروں گا — میں نے بوبی کی طرح  
تمہیں بھی معاف کیا — تم دونوں اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھاتی رہو گی۔  
دنیا تم پر تھوکتی رہے گی — امّ تم اپنے لپنے بچوں کو کبھی ان کے باپ  
کا نام نہیں تباہ کو گی —؟ ”

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈرانگ روم سے باہر چلا گیا — انجمن  
پریشان حال اپنی گردن سہلاتی رہی۔



ٹریبھے تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ آصف ایک کپڑا  
کی دیوار سے ڈیک لگانے پڑھا ہوا تھا۔ اسے بیتے دونوں کی بہت سی  
باتیں یاد آ رہی تھیں۔ کبھی انہم اور کبھی بولی۔ باری باری آنسو پہاتی  
نظر آ رہی تھیں۔ دونوں اپنے پھونکوں کو سینے سے لگانے اس سے کہہ  
رہی تھیں۔

"یہ تمہارا ہے۔ یہ تمہارا ہے۔۔۔"

وہ بڑے ذہنی کرب سے گزر رہا تھا۔

اس سے بہت دور انہم اپنے بھائی دحید کے سامنے ایک صوف  
پر پیٹھی دونوں پانچوں سے منہ چھپانے لود رہی تھی اور کچھ رہی تھی۔

"میری بھویں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہو گیا؟ میں یہاں ڈاکٹر زیدی  
سے ملنے آئی ہوں۔ مجھے شہر ہے کہ لیبارٹری انچارج نے روپورٹ

لکھتے وقت غلطی کی ہے۔"

دحید کے چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر ہو دی تھی۔  
وہ بولا۔

"ڈاکٹر زیدی کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"میں پیسارٹری اسچارج سے ملوں گی۔"

"اس کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو گیا ہے۔ اگر وہ ہر تاب  
بھی وہ ایک سال پرانی رپورٹ کی غلطی کو سمجھ نہ سکتا۔ اس کے علم میں  
جود دست تھا، وہی رپورٹ اس نے پیش کی تھی۔"

وہ روئی ہوئی جب نجلا کر بولی۔

"تو پھر میں کیا کر دیں۔ ہم آصف کو کیسے یقین دلاؤں کر میں  
بد چلن نہیں ہوں۔ میں نے اس کے اعتماد کو تھیں نہیں پہنچاتی ہے۔"

"میں اسے یقین دلاؤں گا۔ وہ کہاں ہے۔؟"

"میں نہیں جانتی۔ وہ بو بی کو ٹھکرایا کر گیا۔ بو بی اسے تلاش  
نہ سکی۔ اب وہ مجھے ٹھکرایا کر گیا ہے۔ میں بھی اسے تلاش نہیں  
سکوں گی۔"

"میں اسے تلاش کر دیں گا۔"

وہ جانے لگا۔ انہیں نے کہا۔

"ٹھہریتے! اگر وہ مل جیا تو کسی ثبوت کے بغیر یقین نہیں  
کرے گا۔"

"میں ثبوت دوں گا۔"

"کیسے۔؟"

دہشتگست خورہ انداز میں ایک گھری سانس لیکر چھوڑتے ہوتے بولا۔

"میں نے بوبی کے لئے گڑھا کھو راتھا۔ میں کبھی سرچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری بہن اسی گڑھے میں گرجائے گی۔"

"کیا مطلب۔؟" ذہ دہید کو گھوڑتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔

"میرے۔۔۔ میں نے رپورٹ بدل دی تھی۔"

ذہ بھری قوت سے پینچ کر لولی۔

"کیسے۔؟"

"لیپیارٹری اسٹنٹ میرار دردار ہے۔ جب وہ رپورٹ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس وقت میں اس سے ملنے گیا۔— ذہ میرے ناجائز کاروبار میں حصہ دار ہے۔— ہم دونوں نشہ آفر دوائیں چور دعا زد سے فروخت کرتے ہیں۔— میں نے اس کی جیب میں ایک ہزار روپے رکھتے تو اس نے صحیح رپورٹ مجھے دیتے ہوئے بتایا کہ آصف بابن سکتا ہے۔— میں نے کہا۔ ایسی رپورٹ تیار کرو۔ جو سے چیلنج کرے کر دے کبھی بابن سکے نہیں۔"

انجمن نے اس کا گریبان پکڑ کر چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہ صحیح رپورٹ کہاں ہے۔؟"

” اسے ہم نے جھوٹی رپورٹ کے طور پر یود میں آصف کو دیا تھا۔“  
انجمن کے ہاتھوں حید کے گرد بیان پر ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ پیچھے ہٹنے لگی  
و حید نے کہا۔

” مجھے جیسے لوگ جو شہر آور دوائیں فروخت کرتے ہیں۔ انہیں ٹری  
ہسپیل پھیری کرنا پڑتی ہے۔ میں ہسپیال کے تمام ڈاکٹروں کے ستخا  
کی نقل کامیابی سے کر لیتا ہوں۔ میں نے اصلی رپورٹ پر ڈاکٹر زیدی  
کے ستخلوں کرنے نکھے۔ ادھ گاڑا مجھے کیا معلوم تھا کہ اس جعل سازی کی  
سزا میری اپنی بہن کو ملے گی۔“

وہ غصہ سے مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

” مجھے بہن مت کہو۔۔۔ پتہ نہیں تھا کہ مجھے دو افراد مش  
ہسپیال کے ملازموں سے مل کر آئئے دن کتنی بہنوں کی زندگیاں بر باد  
کرتے رہتے ہیں۔ تم۔۔۔ تم نے میری اور بوبی کی زندگی بر باد کر دی۔  
ہمارے بچوں سے الہ کے باپ کا نام چھپیں لیا۔ اب ہم آصف کو کہاں  
تلash کریں۔ اسے کیسے یقین دلائیں کہ شیطان بھائی کے روپ میں  
بھی بہن کا سہاگ اجاڑ دیتا ہے۔“

” میں اسے تلاش کروں گا۔۔۔ میں اسے یقین دلاوں گا۔“  
وہ تیزی سے چلتا ہوا کرے سے باہر چلا گیا۔

آصف بے مقصد بکھنکے رہا تھا۔ ہولکے روشن پر اڑند والے پتے کی طرح اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ کبھی آبادیوں میں اور کبھی وریانوں میں اس کا سفر جاری تھا۔ اس کی دارجی بڑھی ہوئی تھی۔ پڑھے میلے تھے۔ مگر اسے اپنا ہوش نہ تھا۔ ایک چالنے خانے کی ایک میرے کے اطراف دو شخص بیٹھے چاہے پر رہتے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے پڑھے ساتھی سے کہا۔

”حمدہ بھائی! اس دھندے میں جیل کی سلاخیں نظر آتی ہیں۔ مگر کھاتی بہت ہے۔ تم نے بڑی دولت کمائی ہے：“  
حمدہ ورنے چالنے کا گونڈ نکلتے ہوئے کہا۔  
”ہاں! دولت کمائی ہے مگر نقصان بھی اٹھا رہا ہوں۔ جمعے کینسر

ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔  
کینسر ۔ ۔ ۔

”ہاں ۔ ۔ ۔ وہ جو کہتے ہیں نا، کوئی کی دلآلی میں سنبھالا ہوتا ہے۔  
تو وہی بیرا حال ہے ۔ ۔ ۔ نشہ آدد دوائیں فروخت کرتے کرتے میں خود نشہ کا  
عادی ہو گیا ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر نے میرے مرض کو سمجھنے کے بعد رپورٹ لکھ دی کہ  
جسچے آدمی کو ہسپتال کی لیپیاڑی میں ملازم نہیں رکھا جاسکتا۔ اس  
لئے میری تعییٰ ہو گئی ۔ ۔ ۔“

اس نے چلتے کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

”میں نے ناجائز دعند سے کہتے ہم جیسے لوگ قانون کی گرفت  
سے پچھلے ہیں۔ مگر ادپروں کی لکھی ہوئی سزا ہمیں ضرر ملتی ہے۔  
میرے ایک ساتھی کو جمی اس کی سزا مل رہی ہے۔ اس نے ایک شخص  
کو بازجوہ ثابت کرنے کے لئے میری تیار کی ہوئی رپورٹ کو بدل دیا تھا۔  
ایسے وقت کا نسب تقدیر ہم پر سنتا ہے ۔ ۔ ۔ جانتے ہو کیا ہوا ۔ ۔ ۔  
خود اس کی بہن اس بانجھ آدمی کی بیوی بن گئی ۔ ۔ ۔ ادب اس کے  
بیچے کی ماں بننے والی ہے ۔ ۔ ۔“

”اوہ! یہ تو سچ پچھ قدرت کی طرف سے دی ہوئی سزا ہے۔“

”ہاں ۔ ۔ ۔ اب وہ اپنے بہنوئی کو تلاش کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ دعا بارہ  
ڈاکٹری معاشرے سے ہی ثابت ہو سکتا ہے کہ پہلی رپورٹ غلط تھی۔“  
حمد و کو اپنے پیچے ایک آداز سناؤ دیا۔

"اس سالے کا نام کیا ہے۔؟"

حمدو نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پیچے تباہ حال آصف  
کھڑا ہوا تھا۔!

اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو۔؟"

آصف نے اس کا گریبان پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا نام بتاؤ۔ ورنہ کینسر سے پہلے میں تمہیں مارڈاں گا۔"

"دا۔ دا۔ وجید۔ اس کا نام وجید ہے۔ سول

ہسپتال کے احاطے میں اس کی دواڑی کی دکان ہے۔ . . ."

آصف نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ پھر داشت پیتے ہوئے دبای  
سے جانے لگا۔ اس کا دماغ چیخ رہا تھا۔

"فریبی۔ مکار۔ دونوں بھائی بہن مکار ہیں۔ انہوں نے اپنا  
پرانا انتقام لیا ہے۔ وجید بو بی کو دوبارہ حاصل کرنا چاہا تھا۔ اور  
انہیں نے مجھے چیتی کے لئے لپنے بھائی کے ساتھ مل کر یہ چال چلی ہے  
میں۔ میں دونوں کو زندہ نہیں چھوڑ دیں گا۔ . . ."

اس کا دماغ چیخ رہا تھا۔ دھ داشت پیس رہا تھا۔ اس کی  
سمیاں بھی ہوتی تھیں۔ اور وہ ایک سمت بڑھتا جا رہا تھا۔

جھنگی کے اطراف تیز ہوا یئس چل رہی تھیں۔ جھنگی کے اندر بوڑھا بابا پڑھاتا ہوا دروازے کی طرف جا رہا تھا۔  
”کیا صیحت ہے۔ غریب کی جھونپڑی کو یہ ہوا یئس بار بارستا قی  
ہیں۔ دروازہ بار بار کھل جاتا ہے۔“

وہ دروازے کو بند کرنے کے لئے آیا۔ پھر باہر کی طرف دیکھ کر رک گیا۔ باہر آصف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے پیٹی ہوتی چادر ہوا کی زد میں ارادھر سے اُدھر پھر پھر اڑ رہی تھی۔ بوڑھا آنکھیں سکر کر اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا جھنگی سے باہر آیا۔ آصف کی دار حی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر گرد جمی ہوتی تھی۔ بوڑھا نگلی اٹھا کر کہا۔

”میں نہ تھیں پہلے بھی دیکھا ہے۔“

وہ دُھرے ہوئے لپچے میں بولا۔

"ہاں۔ جا بنا! ابک بار آپسے کہا تھا یعنی تھہ نیب اچھو  
نہیں ہے۔ ان کو رلاتی ہے۔"

بڑھا باد کرنے لگا۔ آصف نے کہا۔

"آپ نے کہا تھا کہ انہی بھری اڑا پسند، مستولہ کہ ساتھ سبز  
تفریج کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔"

"اوہ بوبی... تم بوبی کے شوہر ہو۔ آئے جوں تجھکی میرا تو۔"

"نہیں۔ میں صرف یہ بچھنے آیا ہوں کہ اس روز بھبی اور کتنا کا  
بوائے فرینڈ بھبک کریاں آتے تھے یا محشکنے کے لئے آمد تھے؟"  
بڑھنے نے کھڑی نظریں سے اسے دیکھا۔ پھر سر پر لکھ رہا۔

"بھبک سراۓ آتے تھے۔!"

آصف نے چاہدستے ہاتھ نکالا۔ سوسو کے کئی نوٹ اس کی طرف

پڑھاتا ہوا بولا۔

"میں پچ بولنے کی قیمت اس سے بھی زیادہ دوں گا۔"

"دولت کے تراند میں تو لے جانے والا پچ، پچ نہیں ہوتا۔ اس

لارچ کو اپنی جیب میں لکھو۔ اس روز بھی اس شیطان نے مجھے  
بڑے بڑے نوٹ دیئے تھے۔"

پہ کہہ کر اس دن کا واقعہ سنانے لگا۔ آصف گم حمہ ہو ل رامپے دماغ  
کی اسکرین پر اس واقعے کی فلم دیکھ رہا تھا۔

اسکرپٹ پر وجد نظر آیا۔ وہ بیب نہیں کر دس سکے کچھ نوڑتے  
نکال کر بولٹھے کو دیتے ہوئے کہ رہا تھا

”ترماں چاٹے پلا دد۔ اعدہال دروازے پر وہ تو کہ نہ دینا ہے میر  
خود یہ آکر راستے لے جاؤ گا۔“

بڑھانوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ مگر جب وجد نے کرے  
میں جا کر دروازے کو بند کیا۔ بولٹھا پا باہری سنجیرگی سے بند دروازے  
کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ وجد نے اندر آگر بوبی کی جانب دیکھا  
وہ سمجھیگی ہوتی چارپائی پر ہری تھی۔ بدلتے نشیب و فراز گیسے لباس کے  
سچھے بخارست کر رہے تھے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو لچار ہے تھے۔

دیدر زپنا کوٹ اتار کر اسے دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر بوبی کی ہر فر  
بڑھنے لگا۔ وہ آنکھیں بند کئے سردی سے سکر دہی تھی۔ کوٹ کی سیاہی  
اس کی ہرف بڑھتی اور بھیلتی جا رہی تھی۔ چڑاس کی چین سنائی دیا۔

بولٹھا باہر دسرے کمرے سے دوڑتا ہوا باہر آنے لگا۔ بوبی اپنی  
حفاظت کے لئے بعد وجد کر رہی تھی۔ وجد اسے اپنی گرفت میں  
لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ باہر دروازہ پیٹ کر کہہ رہا تھا۔

”دردازہ کھولو، یہ کیا ہو رہے ہے۔ دردازہ کھولو۔“

بوبی وجد کی ناکام گرفت سے آزاد ہو کر چارپائی کے دوسرا  
طرف چنی گئی۔ وجد چارپائی پر چڑھ کر آنا چاہتا تھا۔ بوبی نے چارپائی  
کو ایک طرف سے اٹھا دیا۔ وجد اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ ایک طرف

اللش کو فرش پر آ رہا۔ اس کے اوپر بچار پانی اٹھ گئی۔ جب وہ اٹھ بجھن جا رہا  
کے نیچے سینے لکھتا تو بدبی دروازہ کھوار پکر گئی۔ بوڑھا بابا ہاتھ میں دھان تھی لئے  
کھڑا تھا۔ اس نے نوٹیں کو جیب سے منہ پر مارتے ہوئے کھڑا کھڑا کھڑا۔

”میں نے تم دو نوٹ کو میان بیوی سمجھا تھا مگر تم تو شیخ مہمان نکلے۔“

بوی نے روٹے ہوئے کہا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکیں گی۔ میری جان میرا جنم عرف نہیں  
شوہر کے لئے ہے جبکہ اب تک نہ ہو کر تم بُخھرہ جہان ناپاک ارادے سے  
بیان لائے تھے تو وہ.....“

بوڑھہ بابا نے اس نے سر پر ٹوٹھ رکھ کر کہا۔

”میں بیٹی کا اپنے شوہر سے کچھ نہ کہنا۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھوں جائے  
اس بات کو تعییں میں چاہتا کرو۔“

چھر بابا نے دعید کو ٹھوڑا تر ہدسه کہا۔

”یہ اس درانیوں سے مر جاؤ۔ تو کوئی سر کتا ہوں۔ مگر بات بڑھ کی  
تو یہ لڑکی بذمام ہو جائے گی۔ بابا بھاگ جاؤ جہاں سے.....“

و جید تیزی سے چلتا ہوا کہے سے باہر چلا گیا۔ بوی نے روٹے ہوئے  
اپنا سراپا کے شانے پر زور دیا۔

آصفہ کے دہانی کی اسکے نہ وہ منتظر ختم ہو گیا۔ اب بوڑھہ کی  
آواز کا نوٹ کے ذریعہ دل میں اتر بی تھی۔

”بوی پاک دامن ہے۔“ دھنی پاک بیزگی سے آئی تھی، آئی ہی پاک بیزگی

ستے والپر گئی۔ یاد ہے تم نے مجھ سے کہا تھا کہ بیمار بیوی کے درمیان اختماد کا رشتہ ہوتا ہے۔ پھر آج کیا بات ہوتی کہ اختماد کے دلگر نکلتے ہوئے قدموں سے پہاں آتے ہو۔ . . . ”

آصف کے قدم را پسی کے لئے مرنے لگے۔

قدموں کو جب منزل مل جلتے تو ناجیل آپ سی آپ سمجھنے لگتے ہیں۔ بوی کی آداز سنائی دے رہی تھی۔ وہ نظروں سے زد اپنے بچے کے لئے بوی اگار ہی تھی۔ لوری جو آنکھوں کو گھری نیند مسلا دیتا ہے۔ آصف کے قدم اعلیٰ طے کے گرد کے پاس پہنچ گئے۔ وہ لیٹا کھو کر داخل ہو رہا تھا۔ خواں رسیدہ لان میں سوچتے ہوا میں ادھر سے ادھر بکھر رہے تھے اور لوری کی دھن میں راہ رہے تھے۔ وہ آہتہ آہتہ جلتا ہجادر؛ از سکے پاس پہنچ گیا۔ مدعا ذہ کھلا ہوا تھا۔

بوی اپنی اجرٹی ہوئی خواب کا کے فرش پر بیٹھی ایک ڈدر کو تھاڑے پانٹے کو جعبد اسی تھی۔ لوری گا رہی تھی۔ پھر دروازے کی طرف دیکھتے ہی اسرائی آداز تھم گئی۔ وہاں آصف سر جھکانا تھا کھلا تھا۔ بوی بے لیقینی سے دیکھتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”تم۔۔۔ تم آئے ہو؟ میری بربادیوں کا تماشہ دیکھنے؟“

”دہ ندامت سے سراٹھا کرنو لا۔“ بوی۔۔۔!

”ہاں بولو۔۔۔ کیا میری غلطی بتانے آئے ہو۔ خدا کی قسم میں اپنک اپنے ناکریہ گناہوں کی سزا تم سے پانے کے لئے زندہ ہوں۔ بولو۔۔۔“

”غلطی تمہاری نہیں میری تھی۔ میں انہم اور دعید کے فریب میرا آگیا تھا۔ انہوں نے غلط میڈ لیکل رپورٹ دی تھی کہ میں باپ نہیں بن سکتا۔۔۔۔۔“

بولی اس سببے ایقینی سے دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ دھ بولا۔

”میں تمہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری فرماں پر انہم اور دعید نے ایک جعلی رپورٹ تیار کی۔ تمہیں تسلی دی کہ میں باپ بن سکتا ہوں مگر۔۔۔۔۔ مگر دی جعلی رپورٹ دست نہیں۔ اور میں۔۔۔ میں تمہارا کہ تمہارا بچہ۔۔۔۔۔ میرا میرا نہیں سمجھ سکتے۔۔۔۔۔“

بولی کے ذہن کو جو بڑھا سا لگا۔ وہ غصہ میں بولی۔

”تم نے میرے لئے ایسی شرمناک باتیں سرچ لیں؟ اب کیا لینے آئے ہو۔

میں بے حیا ہوں۔۔۔۔۔ بہ پیش ہوں۔۔۔۔۔ چنانچہ جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“

میں جانے کے لئے نہیں۔۔۔۔۔ میں پالے کے لئے آیا ہوں۔۔۔۔۔ تم زیادہ جے زیادہ میری غلطی کی نزاں بچھے سنا سکتی ہو۔ مگر میرے رشتے سے اذکار نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔

”اہ، اسجاگ کے رشتے سے اذکار نہیں کر سکتی مگر انتہا دکار شتم اٹھ بچھا ہے۔۔۔۔۔“

”تم بھول رہی ہو بیبا! ایک رشتے کی زنجیر اونچے ہے جو ہمیں کبھی الگ نہ ہوتے دسکو!۔۔۔۔۔ اور زد اولاد کے رشتے کی زنجیر ہے؟“

بولی کی خامی ستر آنکھوں سے آنسو بینے لگے۔۔۔۔۔ دھ بولا۔

”جب میں اپنے بچے کو سینے سے لگاؤں گا تو تم خود ہی کھینچی چلی آؤ گی۔۔۔۔۔“

بچے تھا تو مجری بیٹھی ہے یا بیٹھا۔۔۔۔۔“

وہ پوں سیکنے لگی جیسے سانس انک انک کر آ رہی ہے۔۔۔۔۔

”تم نہیں بتا ذکر کیا۔ میں سمجھ گیا۔ بیڑا ہی ہو گا۔ عیرا ڈیا۔۔۔ میرا مذہب۔۔۔“  
وہ آسے ہے ٹھنڈا ہوا پانچ سو کے پاس، آگر جھکا پھر تینے ایک زبردست دھماکہ  
رہتا۔ اس کی رگاہوں کے سلسلے پالنا اور ہر سے اُدھر ہو رہا تھا۔ بے جان گزیا  
سور ہی تھی۔ اور بو بیک کے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں پھر پھر انی ہوتی  
تھیں کہ دُرُون کی طرح کرے کی تعدد فضائیں بھیڑا۔ رہی تھیں۔ وہ روک روک فر پا بد  
کر رہی تھی۔

”تمہنے مجھے سہاگن بنایا کہ سہاگ کی خوشیاں چھین لیں۔ وہ پیدا ہوتے  
ہی یہ زی محنت کے ار ازا، کے ساتھ دفن ہو گیا۔ تم بھی ظالم، تمہارا بیٹا بھی  
ظلم۔۔۔ وہ ڈلا کر چل گیا۔ تم ڈلانے آئے ہو۔۔۔ میں عورت تھیں۔ اپنے  
سب پکڑ بارندے کے بعد پھر ایک بار تم سے بارجاؤں گی۔ تم سر کے تاج بنے رہو  
میں پھر بارڈاں کی جو قی ہزا جاؤں گی۔ میں اور کرن بھی کیا سکتی ہوں۔۔۔“  
وہ منہ پھپا کر رونے لگی۔ آصف نہ امانت اور صدمات سے چمد ہو کر  
آسہتہ آہستہ اس کے قریب آیا۔ پھر اس نے بو بی کا ہاتھ تھام لیا۔ بو بی  
نے سراٹھا کر رائے بھری آنکھوں سے دیکھا۔ پھر ایک دم سے چین کر اس سے  
پٹا گئی۔ دھاڑی مار مار کر رونے لگی۔  
آصف نے اسے تھوڑی دیر تک رو نے دیا۔ پھر اسے تھپک، تھپک  
کر کہا۔

چپ ہو جاؤ بوبی! میں جمع کا سچوڑا ہوں، شام کو واپس آ جیا ہوں  
میں حرف تھیں اپنا سمجھتا ہوں اسی لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہارے سوا

می اکوئی خوبی ہے ۔

وہ فوراً ہی آصف سے الگ ہو کر بولی۔

و انہیں ... انہیں تمہارا ہے۔ جسکے جھوٹے بچے سے بگا رکایا ہے

اے کیوں بھول بے ہو۔ جے۔

"اُرپ میرا اس۔۔ کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

”اب تو جھوٹی نہ بولو۔ کیا ترے شاہزادی خیس کی تھی؟“

”کی تھی۔ مگر اسے بملاق دے دی۔“

طلاب ..... ؟

ہاں — پہلے بیس نے سو دپاٹنکرہ اسے اور وجہہ کو گولی مار دوال۔ پھر  
بچھے تمہہ ار اخیال آیا کہ میں تقابل بکرا س لگھر کی جنت کو اور زیادہ جہنم بنادول گناہ  
جیل جانے پا پھانسی پانسے کے بور میرا بچہ میرے ساتھ سے محروم ہو جائے گا۔  
اور بزر جانے تم اسے لیکر کھار کھار، ٹھوکریں کھاؤ کی۔ اس لئے میرے نے اسے  
طلاق دے دی۔ اس نے اپنے بھائی کے ساتھ ملکر تمہہ ارس، خلافہ سازش  
کی۔ بچھے دھوکہ دیا۔ اس کی منزہ بھی ہے کہ وہ سوسائٹی میں طلاق پانے والے عورت  
سمیاء اور اس کا بچہ بیٹھ کر لئے میرے ساتھ سے محروم ہو جائے ۔۔۔۔۔

1

۴ انہیں کی گود میں بچپہ مورا تھا۔ وہ پلنگ سکے سر سے پر بچپے کو گود  
پر لئے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لیٹر پیڈ کے سائز کا ایک لاغز تھا

بکھرے ہوئے بال اور پریشان پھرہ بجا رہا تھا کہ ددبری طرح برپا دہنچکی ہے۔  
وجید دروازہ کھول کر سر جھک کاتے کمرے میں راضل ہوا۔ پھر اس نے  
سرائھا کر دیکھا۔ دونوں بھائی بھن کی نظر پر بیس۔ انھن کی آنکھوں سے آنسو  
بیٹھ لگے۔ وجید نے تنکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے اسے بہت تلاش کیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔“  
سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں تلاش کروں۔؟“  
انھن نے ہنوملوں کو بھیخ کراپنے بھائی کو غصے سے دیکھا۔ پھر  
کہا۔

”ودھل گیا ہے۔“

”بڑا نہیں ہوئرا۔ اگر بڑھتے پڑتے بولا۔“

”مل کیا؟ کیا آسف آگی ہے؟“

انھن نے خاموشی سے گھورتے ہوئے کاغذ کو اس کی طرف بڑھادیا  
وجید نے کاغذ کرہا تھا میں یعنی ہوئے انھن کو سوالیہ نظریں سے دیکھا  
پھر اس کا غذ کی تحریر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

”انھن۔ انھر نے ایک بار بھے ڈھکر کر دبارة مال  
کرنے کے لئے اپنے تیضان صفت بھائی کے ساتھ مل کر  
بھجھے دھوک دیا۔ بوبی کی زندگی پر بار کی اور ایک ڈائرنر کے  
باہر استپیشنے کو بدنام کیا ہے۔ بھجھے معوہ سوچکا ہے کہ تم  
دونوں سماں میں بھن نے کس طرح میٹے یکل روپوں کو بدل دیا۔“

تھوا۔ اب تم میرے بچے کی ماں بن کر بھی مجھے ستاثر نہیں کر سکو گی۔ اپنے بے گناہی کا تفیین نہیں دلا سکو گی۔ نہیں اور تمہارے بھائی کو عبرتناک موت کی سزا ملنے چاہئے۔ مگر میں تمہیں عبرتناک زندگی کی سزا دے رہا ہوں۔

تمہارے فریب اور مکاریوں کا تفیین کر لینے کے بعد میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔۔۔۔۔ تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔۔۔۔۔

”زہ طلاق نامہ“ و جیدر کے چہرے کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ و جیدر نے تھوک نگلتے ہوئے طلاق نامہ کے انقی سے اپنی بہن کو دیکھا وہ سامنے ایک ریوالور تانے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کافی

چھوٹ گیا۔ ”زہ“ تھے اُکر بولا۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔۔؟“

”ڈہ داشت پیشے ہوتے ہوئے بولی۔

”آصف نے یہری چھٹی کر دی۔ میں تمہاری چھٹی کر دوں گی۔۔۔۔۔“

”دہ پیچے ہٹتے ہوئے بولی۔

”کیا پاگل ہو گئی ہو؟ دہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ تمہیں شیری سازش میں شرکت سمجھ رہا ہے۔ میں اس کی غلط فہمی۔۔۔۔۔“

و کیسے دزد کر گے۔ ؟ تم میرے بھائی ہو۔ وہ تمہاری بات کا  
کبھی یقین نہیں کرے گا۔ تم غیرت مند بھائی ہونا۔ ؟ کیا یہ برداشت  
کر سکو گے کہ تمہاری بہن طلاق سیکر زندگی تجزارے .... ؟

”نہیں۔ میں یہ برداشت نہیں کر دیں گا۔“

”اس لئے تمہیں مر جانا چاہیے۔“

”نہیں انہمیں! ایک بھائی کے پیار کو اور اس کی قربانیوں کو  
سمجو۔ میں نے تمہیں ڈاکٹر بنانے کے لئے بوبی کی محبت کو ٹھکرایا۔  
تمہاری خاطر کسی کا گھر داماد بن گیا۔ آصف کو بوبی سے چھین کر تمہارا  
گھر بدلنے کے لئے مید بیکل روپورٹ کو بدلنے کا سنگین سڑم کیا  
کیا میری قربانیوں کا تم یہی صدر دینا چاہتی ہو۔؟“

”جس گھر کی بنیاد غلط ہوا اس کی دپواریں جلد گرجاتی ہیں۔  
بے شک ذہانیاں دینے والے بھائیوں کے لئے بہنیں اپنی جان بھی  
دے دیتی ہیں۔ لیکن وہی بہنیں اپنا گھر بر باد کرنے والے بھائیوں  
کو کبھی معاف نہیں کرتیں۔ میں اپنی دنیا کے تمام مجرم بھائیوں کو  
اپنے یاتھوں میں تمہارے خون کی لالی دکھانا چاہتی ہوں۔...“

ٹھائیں ٹھائیں کی آواز کے ساتھ پرچم چین کو دنے رکھا۔

بُویے نے آصف کا ہاتھ تھام کر کر۔

"نہیں آصف! وہ بچہ تمہارا ہے۔ اس سے تمہارے ساتھ  
سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔"

آصف نے کہا۔

"وہ بچہ جی میرا ہی تھا، جو تمہاری گود میں آیا تھا۔ مگر اس نے تو  
نے اسے میرے ساتھ سے محروم کر دیا۔"

"مگر تم ایک کی سزا دصریح بچے کو نہیں دس سکتے؟"

"آخر تم چاہتی کیا ہو۔؟"

وہ بڑے کرب سے دیکھتے ہوتے بولی۔

"انصاف!... بچے معصوم ہوتے ہیں بڑا کی۔ ازشو  
کو نہیں سمجھتے۔ اس بچے کے ساتھ انصاف کرو۔!"

”مگر اس کے لئے مجھے انہمن کے پاس جانا ہوگا۔ اور میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“

اسی وقت انہیں آواز سنائی دی۔

”بوبی... بوبی! تم کہاں ہو۔؟“

وہ دونوں چونکے گئے۔ بوبی نے کہا۔

”یہ انہمن کی آواز ہے۔۔۔ شہر و میں دیکھتی ہوں۔“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی خواب گاہ سے نکل کر ڈرائیور ردمیں آئی۔ انہمن ایک چادر پیٹے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کے درنوں ہاتھ چادر میں پھپے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بچہ نظر آرہا تھا۔

چند لمحوں تک نہ درنوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ پھر انہمن نے آگے بڑھ کر کہا۔

”میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ آصف یہاں موجود ہے یا نہیں۔ میں تمہارے سامنے اپنی بھاناتی میں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ میں نے تمہارے سہاگ پر ڈاکر نہیں ڈالا تھا۔۔۔ تھا پرانے جو کھیل کو سلا یا ہے۔ میر، اس کھیل کے انجام کو پہنچ چکی ہوں۔ میں نے بانی جوان کو متلا کر دیا ہے۔۔۔“

”متلا۔۔۔؟“ بوبی ایک قدم پہنچے ہٹ گئی۔

”ہاں۔۔۔ اب میں ایک دلبے سفر پر جا رہی ہوں۔ مگر جانے

سے پہلے آصف کی بیر امانت تھیں سونپنے آئی ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں  
تھیارے سراکوتی اس کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ بوبی! میں نے تھیں  
بہت دکھ دیتے ہیں۔ کیا مجھے معاف کر دیں گی؟۔؟

بوبی نے اثبات میں گردان ملائی۔ انہیں نے آنسو بھری آنکھوں  
سے پوچھا۔

”کیا تم اس امانت کو آصف کے پاس پہنچا دیں گی؟۔؟

بوبی نے پوچھا۔

”مگر تم اس سے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو؟۔؟

انہیں جواب دینے کے بجائے بچے کو سینہ ٹراپیبل پر لکھنے  
کے لئے جمع کرنے لگی۔ جمع کرنے کے دوران چار رکھل گئی۔ اس کے باہم  
میں سنتھکری نظر آرہی تھی۔

خواب گاہ کے دروازے کے پیچے کھڑے ہوئے آصف کے  
ذہن کو ایک جھٹکا سالگا۔ باہرستک سنائی دے رہی تھی بھر  
نمکانہ آواز سنائی دی۔

”مسماۃ انہیں بیگم! دیر ہو رہی ہے۔ باہر آ جاؤ۔

وہ سنتھکری والے ہاتھوں کو سینے سے لگانے، بچے کو آنسو  
بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی پیچے ہٹ رہی تھی۔ پھر وہ آصف  
کو دیکھ کر شکھ کر گئی۔ وہ ڈرائیک روم میں آہستہ آہستہ چلتا  
ہوا بوبی کے پاس آ رہا تھا۔

انجمن روتی ہوئی بولی۔

"میں نے تمہیں دھکو کر نہیں دیا۔— تمہیں خدا کا دا سطہ۔ جو نفرت تمہیں مجھ سے ہے، اس کا انتقام میرے بچے سے نہ لینا میں نے تمہیں دھکو کر نہیں دیا۔— میں اپنے بھائی کے جرم کی سزا پار ہی ہوں۔— میں تم سے کچھ نہیں چاہتی۔— لیں میرے بچے کو قبوا کرو۔"

آصف سر جمع بکار کر بچے کے پاس آیا۔— پھر انجمن کو دیکھنے ہوئے بچے کو سینٹرال سیبل سے انٹھا کر سینے سے لگایا۔ وہ خوشی سے سنبھلتی ہے۔— پھر اپنی بدنی پر رونے لگی۔— بچے کی سلالتی ہے مارہی تھی۔— اور تقدیر ڈالا رہی تھی۔—

وہ روتی ہوئی چلی گئی۔— نظر دوں سے ادھل ہو گئی۔  
مگر متنا کا ماتم در تک سنائی دیتا رہا۔

تھوڑی دیر میں ڈانٹگ روم میں ستانہ چھاگیا۔ آصف اور بوبی ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ بولا۔ "میں اس سے الٹا ف کر دیں گا۔— یہ میرا ہے۔ اندھم...؟"

بوبی آہستہ آہستہ ہلپتی ہوئی اس کے قریب آئی۔—  
اس نے بچے کو دیکھا۔ اسے اپنی بات یاد آئی۔— ایک بار  
اس نے آصف سے کہا تھا۔

"میں؛ جو ایک بچے کی آرزد کرتی ہوں تو میرے خوابوں اور

خیالوں میں وہ آپ ہی کا بچہ ہوتا ہے۔ میں صرف اسکی بچے کو سینے سے لگاؤں گی، جو آپ کا ہرگز۔ خواہ وہ مجھ سے ہو یا میری سوکن سے...”  
بُولی نے بچے کو آصف سے لیکر اپنے سینے سے لگایا۔ بچہ آہنگی سے بُولی۔

”میرے تمہارے اور انجمن کے سینے الگ نہیں ہیں۔  
سب اپنے ہیں۔ ان کی یہ تعبیر بھی اپنی ہے۔!  
وہ بچے کو چونٹنے لگی۔

۷۸

## ختم شد

# ہمایہ ادارے کی شائع کردہ کتابیں

## نادل ہی نادل فنی کتابیں روپے

۱۵/-	فن جودو	روپے	برڈش کی بیٹی ایساں سینا پوری ۲۰/-
۱۵/-	آسان کرائے	۱۵/-	لذت آشنا
۱۵/-	ہینپاٹزم کیا ہے؟	۱۵/-	ابنِ آدم
۱۵/-	ہینپاٹزم کے عملی طریقے	۲۰/-	خونِ مشرق و سطی
۱۰/-	دنبا کے چھپر اسرار علوم	۸/-	تلداشِ حق
۱۰/-	آئینہ بیانی اور خل حافظات	۸/-	اسپرِ گردشِ دوران
۱۰/-	ڈیانِ عِینی کا سید	۵/-	آصفہ ناصرادیب
	دیکھ کرافٹ	۵/-	جب یہ شلمہ حل رہا تھا
۱۰/-	کالے جادو پر باتھویر کتاب	۸/-	لیلیٰ خالد
۱۰/-	ہائیں مباثرت	۱۰/-	تجھڑے اول کی پکار
۸/-	کوکِ مثاستر	۸/-	امن کی فاختہ
۶/-	سہماں رات	۱۰/-	اربعوکی آخری کتاب ابنِ الشاد

۱۰۰ روپے تک کے آرڈر بر کمیشن ۳۳%

زیادہ آرڈر بر ۴۵% کمیشن دی جائے گی۔

ڈاک خرچ ہر حالت میں ادارہ برداشت کرے گا۔

کتاب والا ۲۷۹۶ ہماری بھوجپوری دصلی مک